إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اپریل ۲۰۱۴ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۱۸، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۱۴ء/ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ

مشمولات

O فکر و نظر

عمر خالد خراسانی کا خط سراج الحق پشاوری کے نام — مدیر — ۴

O تعلیم و تربیت

نسل نو پر مغربی تعلیم کے اثرات — سید خالد جامعی — ۱۱

دینی مدارس کب توجہ فرمائیں گے؟ — مدیر — ۱۹

O ہمارا دینی تناظر

فرقہ واریت کی وجوہات اور ان کا حل — پروفیسر ملک محمد حسین — ۲۱

O میڈیا

الیس منکم رجل رشید؟ — مدیر — ۲۵

راجہ ظفر الحق، عرفان صدیقی اور احسن اقبال توجہ فرمائیں

O اسلامی تحریکیں

تنظیم اسلامی کا منہج اور چند مغالطے — جمیل الرحمن عباسی — ۳۶

O فقہ و قانون

مسلم ممالک کے باشندوں کے لیے
بلاد کفار کی شہریت غیر شرعی ہے — ڈاکٹر محمد امین — ۳۸

O اسلام اور مغرب

مادی ترقی کا لازمی نتیجہ ـ شناخت کا بحران — محمد ظفر اقبال — ۴۷

O تبصرۂ کتب

جماعت اسلامی اور انتخابی سیاست (پروفیسر طارق بٹ) مدیر

۵۵

مفہومات (محمد قطب/ حامد کمال الدین)

فکر و نظر مدیر

عمر خالد خراسانی کا خط سراج الحق پشاوری کے نام

محمد امین لاہوری کی بھی سن لیجیے

تحریک طالبان پاکستان کے ایک اہم رہنما جناب عمر خالد خراسانی نے جناب سراج الحق صاحب کو جماعت اسلامی پاکستان کا امیر منتخب ہونے پر تہنیت کا خط لکھتے ہوئے انہیں باور کرایا ہے کہ جمہوری جدوجہد سے پاکستان میں شریعت نافذ نہیں ہوسکتی اور یہ کہ اس کے لیے مسلح جدوجہد کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ہم جناب عمر خالد خراسانی صاحب کے اس موقف سے متفق ہیں کہ پاکستان میں مروّجہ جمہوری جدوجہد کے ذریعے شریعت نافذ نہیں ہوسکتی لیکن اس کے باوجود ان کے موقف اور خود جماعت اسلامی کے موقف میں اتنی غلطی ہائے مضامین موجود ہیں کہ ان کے تذکرے کے بغیر ہم قارئین پر یہ واضح نہیں کر سکیں گے کہ پاکستان میں غلبۂ دین کا صحیح طریق کار کیا ہے؟

۱۔ ایک بات ابتداء ہی میں پیش نظر رہے کہ جمہوری جدوجہد اور پرُ امن جدوجہد مترادف نہیں ہیں۔ مطلب یہ کہ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ معاشرے میں غلبۂ دین کے صرف دو طریقے ہیں ایک جمہوری جدوجہد اور دوسرے نفاذ شریعت بذریعہ مسلح جدوجہد۔ اور چونکہ جمہوری نظام کے ذریعے پچھلے ٦٦ سال میں پاکستان میں شریعت نافذ نہیں ہوسکی لہٰذا اب اس کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے اور وہ مسلح جدوجہد کا ہے۔ بلکہ مسلح جدوجہد کے بالمقابل پرامن جدوجہد ہے جس کی مغربی جمہوریت کے علاوہ بھی کئی صورتیں ممکن ہیں جن کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔

۲۔ یہ تصور بھی تصحیح طلب ہے کہ شریعت کوئی ایسی چیز ہے جسے صرف اقتدار کی قوت ہی سے نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دین تو ہے ہی اسلام اور ہم تو ہیں ہی مسلمان یعنی وہ لوگ جو اپنی مرضی سے اپنا سر تسلیم اللہ کے حضور خم کرتے ہیں اور بلاشرط و بلا حدود اللہ کی عبادت واطاعت کا دم بھرتے ہیں لہٰذا کسی مسلمان کو نہ یہ زیبا ہے اور نہ اس کا حق ہے کہ اللہ کی عبادت واطاعت سے منہ موڑے۔ لہٰذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرے اور جب مسلم معاشرہ وجود میں آجائے تو اجتماعی سطح پر بھی جہاں تک ہوسکے اسلامی تعلیمات پر اپنی داخلی خواہش و رغبت سے عمل پیرا ہو۔ اور اگر اس کے بعد مسلمانوں کی اپنی ریاست و حکومت ہو تو اس میں بھی اسلامی

تقاضوں پر عمل کرے اور قوت نافذہ سے مسلمانوں کو اس قابل کرے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کریں۔

مسلمانوں کو فرد، معاشرہ اور ریاست کی ان تینوں سطحوں پر اسلام پر عمل کے قابل بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعے جو طریق کار عطا فرمایا ہے وہ 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ' کا طریقہ ہے۔ یعنی کتاب اللہ کی تعلیم اور تعلیم حکمت کے ذریعے نفوس کا اس طرح تزکیہ کیا جائے کہ اللہ کی عبادت واطاعت ان کے لیے سہل ومرغوب ہوجائے۔ اس اصول پر اگر فرد کو تیار کر دیا جائے تو وہ نہ صرف اپنی ذاتی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر برضا ورغبت عمل کرے گا بلکہ معاشرے اور ریاست کی سطح پر اجتماعی زندگی میں بھی خوشی سے اسلامی احکام پر عمل پیرا ہوجائے گا۔

۳۔ اسلام اعلاء کلمۃ اللہ کا متقاضی ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کا جدوجہد کرنا واجب ہے بلکہ یہ جدوجہد (یعنی جہاد) اسلام میں چوٹی کا عمل ہے لیکن اکثر لوگ بھول جاتے ہیں کہ قتال صرف اس کے آخری مرحلے کا نام ہے اور اس کے باقی سارے مراحل پرامن ہیں۔ نفس کے خلاف جہاد کہ وہ اللہ کی عبادت واطاعت کرے، دین کی نشر واشاعت، تعلیم وتدریس، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، دعوت وتبلیغ و اصلاح اور ان کاموں کے لیے زبان، قلم اور مال سے جدوجہد اور ہر نوع کی مشقت یہ سب جہاد ہی ہے۔ قتال اصلاً یا تو دین کے دفاع کے لیے ہوتا ہے یا اعلاء کلمۃ اللہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے۔ یہ مسلمانوں کے آپس میں لڑنے مرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مسلمان انفرادی یا اجتماعی زندگی میں اسلامی تقاضوں کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوتا تو اسے محبت وخیر خواہی سے سمجھانے اور اس کی اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ اس کے سر پہ تلوار سونتنے کی۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں جو جنگیں ہوئیں ان پر بہت سے صحابہ دل گرفتہ تھے اور اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ کی مظلومانہ شہادت اور شکست سے مسلمانوں نے یہ سبق سیکھا کہ مختلف طرح کی کمزوریوں کے باوجود امت کے سیاسی نظام کو چیلنج کرنے کی بجائے سسٹم کے اندر رہ کر اس کی پرامن اصلاح کی کوشش کی جائے چنانچہ جب تک خلافت کا برا بھلا نظام ۱۹۲۴ء تک باقی رہا مسلمان علماء وفقہاء نے کبھی اس کے خلاف بغاوت و جہاد کا فتویٰ نہیں دیا۔

۴۔ مسلمان جب اپنے ایمان وعمل میں کمزوری کی وجہ سے روبہ زوال تھے تو ان کے حریف اہل مغرب نے انہیں دبوچ لیا، ان کے علاقوں پر قبضہ کرلیا، انہیں کچلا، لوٹا، ان کے اجتماعی ادارے تباہ کر دیے اور پورا نظام زندگی اپنی فکر وتہذیب پر کھڑا کیا اور مسلمانوں کو فکری طور پر غلام بنائے رکھنے کے لیے

کامیاب کوششیں کیں۔ پھر جب انہیں مجبوراً مسلم ممالک کو آزادی دینا پڑی تو انہوں نے اقتدار ان سیاستدانوں، سول اور فوجی بیوروکریسی......کو منتقل کیا جو ان کے پروردہ اور ان کی فکر وتہذیب سے مرعوب ومتاثر تھے۔ چنانچہ کسی اسلامی ملک میں ماضی کی خلافت یا اجتماعی اسلامی اداروں کا احیاء نہ ہوسکا بلکہ سارے اسلامی ممالک میں اہل مغرب کا سیاسی نظام (نیشنلزم وجمہوریت)، ان کا معاشی نظام (سود پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام)، ان کا تعلیمی نظام، ان کا قانونی نظام......معمولی کتر بیونت سے رائج چلا آرہا ہے۔اس کے باوجود جب کچھ مسلم ممالک نے سر اُٹھایا تو اہل مغرب نے پھر قوت سے ان کا سر کچل دیا۔ عراق، افغانستان، لیبیا میں انہوں نے اپنی مرضی کی حکومتیں بجبر قائم کردیں۔یمن، شام، پاکستان، مالی پر حملے جاری ہیں اور فلسطین، کشمیر، چیچنیا، ترکستان، داغستان......میں مسلمان اپنے وجود کی بقاء کے لیے اہل مغرب اور ان کے حلیفوں سے مصروف جہاد ہیں۔

۵۔ پاکستان میں اہل مغرب کی پلاننگ اور عملی مداخلت کی وجہ سے اقتدار ہمیشہ ان لوگوں کے پاس رہا جو اپنا ملک ان کی مرضی اور ان کی تہذیب کے مطابق چلانے پر تیار تھے چنانچہ سارا نظام زندگی آج بھی انگریز کے بنائے ہوئے ڈھانچے کے مطابق چل رہا ہے۔عوام اور دینی قوتوں کے مطالبے پر اگر کچھ اسلامی چیزیں مان بھی لی گئی ہیں تو ان پر عمل درآمد نہیں ہوا اور پولیس، فوج، عدلیہ، انتظامیہ، میڈیا......سب کی تربیت اس طرح کی گئی ہے کہ ان میں سے کوئی ادارہ اور اس کے افراد اسلامی نظام حیات پر عمل کے لیے تیار نہیں گو زبانی کلامی اور کاغذی کارروائی کی حد تک اسلام زندہ باد کے نعرے خوب لگائے جاتے ہیں اور آئین وقوانین میں اسلام خاصی حد تک موجود ہے۔

۶۔ مسلم ممالک میں جہاں بھی اسلامی قوتوں نے سر اُٹھایا اور اسلام کو اپنے احیاء کی بنیاد بنانا چاہا، مغربی قوتوں نے انہیں یا تو حیلے بہانے اور پرکاری سے ان کے کچھ معصوم مطالبے مان کر انہیں جمہوریت کے راستے پر ڈال دیا اور منصوبہ بندی اور سازشوں سے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا اور اگر وہ رکاوٹوں کے باوجود کامیاب ہوگئے تو انہیں حکومت نہیں کرنے دی گئی اور فوج کے ذریعے ان کو کچل دیا گیا جیسا کہ ماضی میں الجزائر اور فلسطین میں اور حال ہی میں مصر میں ہوا ہے اور جہاں مجبور ہوکر دینی قوتوں نے ہتھیار اُٹھائے وہاں انہیں مخالفین اور فوج کی مدد سے کچل دیا جیسا کہ انڈونیشیا، شام، لیبیا، مصر، نائجیریا اور دوسرے بہت سے ممالک میں ہوچکا ہے۔

اس میں استثنائی کامیابی اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے صرف افغان مجاہدین کے حصے میں آئی جنہوں نے بے مثال قربانیاں دے کر پہلے روس جیسی سپر پاور کو اور اب امریکہ ویورپ کو خاک چاٹنے پر

مجبور کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ انہیں آئندہ کے مراحل میں بھی نصرت و کامیابی سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ تمہید طولانی ہوگئی۔ اب آیئے عمر خالد خراسانی اور سراج الحق صاحب کے موقف کی طرف۔

ہم اگر جان کی امان پائیں تو ادب کے ساتھ دونوں سے ایک سوال کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی جماعتوں نے منہج انبیاء کے مطابق 'تعلیم کتاب وحکمت وتزکیہ' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے مسلمان عوام وخواص کی اصلاح اور انہیں اور اچھا باعمل مسلمان بنانے کے لیے یا بالفاظ دیگر فرد کی تعمیر شخصیت و کردار اور معاشرے کی اصلاح کے لیے کیا کوششیں کی ہیں؟ دس سال طالبان پاکستان کو مسلح جدوجہد کرتے ہو گئے کیا اس سے پہلے زیادہ نہیں صرف دس سال انہوں نے فرد و معاشرے کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور عمل کرنے کے لیے تیار کرنے پر لگائے تھے؟ اور ۶۶ برس پاکستان کو بنے ہو گئے اور سراج الحق صاحب کی جماعت نے شروع ہی سے سیاسی جدوجہد شروع کر دی تھی۔ سوال یہ ہے کہ سیاسی جدوجہد کے اثرات سمیٹنے سے پہلے لوگوں کو اچھا مسلمان بنانے اور اسلام کی حمایت میں ان کی تعلیم و تربیت اور اصلاح معاشرہ کے لیے انہوں نے کتنے سال جدوجہد کی؟

ہم نہایت ادب سے پوچھتے ہیں کہ جب مجاہدین نے پر امن جہاد کے ذریعے تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ اور عوام وخواص کے دل و دماغ کو اسلام کے مطابق بدلنے کی جدوجہد ہی نہیں کی تو ان کو جہاد بمعنی قتال کا حق کیسے پہنچتا ہے؟ اور سراج الحق صاحب کی جماعت نے جب پاکستان میں اصلاح فرد و معاشرہ کے لیے آج تک اگر جم کر کام ہی نہیں کیا تو وہ عوام کے ووٹوں کی طاقت سے کامیاب ہو کر غلبۂ دین کے خواب کیوں دیکھتی ہے؟

اگر اہل جماعت کہیں کہ وہ یہ کام کرتے رہے ہیں تو یہ بداہتاً غلط ہے کیونکہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۸ء میں ترجمان القرآن میں اعلان کیا تھا کہ ہم اصلاح معاشرہ کا اصل طریقہ چھوڑ کر سیاسی جدوجہد کا طریقہ اس لیے اپنا رہے ہیں کہ تحریک پاکستان میں قوم اور مسلم لیگ نے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا وعدہ کیا ہے اور یہ کہ ہم اس میں کامیاب نہ ہوئے تو واپس اصلاح فرد و معاشرہ کے طریقے پر کام کی طرف پلٹ جائیں گے۔ ربع صدی تک اس منہج پر کام کرنے کے بعد ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں شکست کے بعد مولانا مودودیؒ نے اصلاح فرد و معاشرے کے منہج کی طرف واپس لوٹنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن جماعت نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

ہم عمر خالد خراسانی صاحب اور ان کے ساتھیوں کے غور و فکر کے لیے چند باتیں اور بھی عرض کرنا چاہتے ہیں:

۱۔ کیا انہوں نے کبھی غور کیا ہے کہ طالبان افغان کا ہدف کفار یعنی امریکہ اور اس کے حلیف ہیں لیکن طالبان پاکستان کا ہدف کفار کیوں نہیں بنے اور ان کا ہدف پاکستان کیوں ہے؟ جب کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان کی مسلح جدوجہد شروع ہی اس وقت ہوئی جب امریکہ و نیٹو نے افغانستان پر حملہ کیا اور پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ قبائل کو جہاد افغانستان میں حصہ لینے سے روکے ورنہ وہ خود ان پر زمینی حملہ کر دے گا۔

۲۔ ہمیں تسلیم ہے کہ تحریک طالبان پاکستان میں بہت سے لوگ مخلص ہیں اور وہ اللہ کے لیے لڑ رہے ہیں لیکن اس امر سے انکار بھی ممکن نہیں کہ امریکہ اور اس کے حواریوں نے کئی تنظیمیں اور گروپ بنا رکھے ہیں جو نام تو طالبان اور شریعت کا لیتے ہیں لیکن کام امریکہ، یورپ اور بھارت کے لیے اور پاکستان کے خلاف کرتے ہیں تاکہ پاکستان کمزور ہو جائے اور ٹوٹ جائے۔

۳۔ افغانستان کے مخصوص حالات تھے، اور وہاں اصلاً جہاد کفار کے خلاف تھا...... لیکن افغانستان کے علاوہ کسی اسلامی ملک میں آج تک کوئی ایسی جماعت کامیاب نہیں ہوئی جس نے نفاذ اسلام کے لیے مسلح جدوجہد کی ہو لہٰذا آپ کے کامیاب ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں کیونکہ آپ کے حالات افغانستان جیسے نہیں اور امریکہ و نیٹو کے افغانستان سے جانے کے بعد آپ کے لیے حالات مزید کٹھن ہو جائیں گے لہٰذا ہم نہیں چاہتے کہ طالبان پاکستان مزید جانی قربانی دیں۔

۴۔ اس میں شک نہیں کہ خرابی کی جڑ پاکستان کے حکمران طبقے ہیں جو امریکہ و یورپ کی اشیر باد پر اور حب دنیا اور حب جاہ و مال کے لیے پاکستانی معاشرے اور ریاست کو اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں چلا رہے لیکن اس کے لیے ہماری دینی قوتوں نے پرامن جدوجہد کا حق ادا ہی نہیں کیا یعنی تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کے لیے بھرپور جدوجہد نہیں کی اس لیے اسلام کے حق میں نہ سیاسی جدوجہد کی کامیابی کا امکان ہے اور نہ مسلح مزاحمت کا اور نہ امریکہ و یورپ اور ان کے حلیف اور مقامی حمایتی انہیں کامیاب ہونے دیں گے اور اگر وہ یہ کام کر لیتے یعنی تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کا تو لوگوں کی زندگیوں اور معاشرے میں اسلام آ چکا ہوتا اور ان کا مقصد بڑی حد تک حاصل ہو چکا ہوتا اور اس عوامی حمایت اور قوت کے سامنے ریاست بھی زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں نہ کر سکتی۔

اسی لیے ہم طالبان پاکستان اور حکومت پاکستان کے مابین مذاکرات کے حامی ہیں اور چاہتے ہیں

کہ یہ مذاکرات کامیاب ہوں اور طالبان نے آج تک جو جدوجہد کی ہے اسے وہ نفاذِ شریعت کی شکل میں زیادہ سے زیادہ کیش کرالیں۔ خدانخواستہ اگر ایسا نہ ہوسکا تو اس کا ان کو بھی نقصان ہوگا اور پاکستان کو بھی اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمن خوش ہوں گے۔

تلخیص مباحث

ہم نے سطور بالا میں جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خراسانی صاحب کی تحریک نفاذِ شریعت کے لیے مسلح جدوجہد کر رہی ہے اور سراج الحق صاحب کی جماعت غلبۂ دین کے لیے جمہوری سیاسی جدوجہد کر رہی ہے لیکن دونوں نے تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کے اس منہج پر جم کر کام نہیں کیا جو قرآن کی رو سے منہج انبیاء ہے یعنی تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس لہٰذا دونوں کی کامیابی مخدوش ہے۔ انہیں اور دوسری دینی قوتوں کو چاہیے کہ وہ اس پیغمبرانہ منہج کے مطابق کام کرنے کی طرف لوٹ آئیں اور ایک معقول مدت تک اس پر کام کرنے کے بعد اس کے نتائج واثرات سیاسی واجتماعی زندگی میں سمیٹنے کا سوچیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے، جنہیں لوگ حکیم الامت کہتے ہیں، ایک دفعہ فرمایا تھا کہ اگر مجھے حکومت مل جائے تو (حدود وغیرہ نافذ کرنے سے) پہلے دس سال تک لوگوں کی اصلاح کروں گا (تا کہ وہ اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں شریعت پر عمل کرنے کے لیے برضا ورغبت اور ذہناً وقلباً آمادہ ہوجائیں) لیکن یہ عجیب لوگ ہیں جو تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کا کام کیے بغیر مغربی طرز کی جمہوری جدوجہد کے ذریعے غلبۂ دین کے خواب دیکھتے ہیں اور مسلح جدوجہد کے ذریعے کفار کا مقابلہ کرنے کی بجائے گنہگار مسلمانوں کو مار کر شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں جب کہ معاشرے کے عوام وخواص پر نہ انہوں نے محنت کی ہے اور نہ وہ ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔

ہمیں تحریک طالبان پاکستان اور جماعت اسلامی کے مقاصد سے اتفاق اور ان کی جدوجہد سے ہمدردی ہے اس لیے ہماری درخواست ہے کہ ان خیرخواہانہ جذبات کو مخلصانہ گزارشات وتجاویز سمجھا جائے اور اسے تنقید ومخالفت نہ گردانا جائے۔

آخری بات یہ کہ عمر خالد خراسانی صاحب تحریک طالبان کے لیڈر ہیں اور سراج الحق صاحب جماعت اسلامی کے قائد جبکہ ان سطور کے راقم کے پاس اخلاص، برسوں کے غور وفکر اور تدریس وتالیف کے سوا کوئی متاع نہیں......لیکن اگر وہ حزبی تعصب سے بالاتر ہوکر معروضیت اور دردمندی سے اس اصول کو پیش نظر رکھیں کہ ''یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے اور یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے'' اور غور وفکر کریں تو پھر ان کو

ہماری گزارشات میں وزن محسوس ہوگا،ان شاءاللہ۔

هذا من عندنا و العلم عند الله

قارئین البرہان کے نام

① جن اصحاب نے ایک دفعہ سالانہ چندہ بھجوایا جو ختم ہو گیا لیکن پرچہ اب بھی ان کو مل رہا ہے۔ وہ اگلے سال کے لیے زراعانت بھجوادیں یا ہو سکے تو تاحیات خریدار بن جائیں۔

② اگر آپ کے پاس پرچہ اعزازی آتا ہے اور آپ کو پسند ہے اور آپ مالی وسعت رکھتے ہیں تو ۴۰۰ روپے سالانہ زراعانت اس زمانے میں کوئی بڑی بات نہیں، بھجوادیجیے تاکہ انتظامیہ پر مالی بوجھ کم ہو۔

③ اگر آپ خوشحال ہیں اور پرچہ آپ کو پسند ہے تو ۵۰۰۰ روپے بھجوا کر تاحیات خریدار بن جائیں۔ اگر آپ کاروبار، تجارت یا مارکٹنگ کے شعبے سے وابستہ ہیں تو البرہان کو اشتہار دیجیے یا دلوایئے۔

④ اگر پرچہ آپ کو اعزازی طور پر ملتا ہے اور آپ کی دلچسپی اور پسند کا نہیں تو ازراہ نوازش خط، SMS، ای میل یا فون کے ذریعے مطلع فرمادیں تاکہ اس کی ترسیل بند کردی جائے۔

⑤ اگر آپ مالی طور پر کمزور ہیں لیکن البرہان پڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مطلع کیجیے، ہم پرچہ آپ کے نام جاری کردیں گے۔ لیکن اگر آپ ۴۰۰ روپے سالانہ ادا کر سکتے ہیں تو پرچہ فری نہ منگوایئے، خرید کر پڑھیے۔

⑥ البرہان کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹایئے، خود خرید کر پڑھیے، دوسروں کو خریدنے کی ترغیب دیجیے، دوسروں کو خرید کر دیجیے۔ اس کی ایجنسی لیجیے۔ اس کے تاحیات خریدار بنیے۔

⑦ مدیر البرہان کی کتابیں بلا معاوضہ مانگ کر شرمندہ نہ کیجیے۔ تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ اتنی مالی سکت نہیں رکھتا کہ کتابیں طبع اور تقسیم کرے۔ ہم قارئین کی سہولت اور اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے صرف اتنا کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی جو کتابیں مختلف پبلشرز نے طبع کی ہیں، وہ خرید کر طلب کرنے والوں کو بھجوادیتے ہیں۔ اگر آپ کو ٹرسٹ کے مقاصد سے دلچسپی ہے تو کتابوں کی طباعت و تقسیم میں ادارے سے مالی تعاون فرمایئے۔

عبدالمجید
(سرکولیشن مینجر)

تعلیم و تربیت　　　　سید خالد جامعی ☆

نسل نو پر مغربی تعلیم کے اثرات

انگلش میڈیم سکولوں کے نصابات کا ایک جائزہ

کراچی میں ERDC تعلیم وتدریس سے متعلق مشاورت کا ایک معروف ادارہ ہے۔ اس کے سربراہ جناب سلمان صدیقی اور ان کے رفیق کار جناب زبیر شیخ صاحب نے ڈاکٹر عبدالوہاب سوری اور راقم الحروف کو دعوت دی کہ وہ کراچی کے چند اہم ترین اسکولوں کے مالکان، منتظمین، مہتمم، مدرسین اور بہی خواہوں کی ایک خصوصی نشست میں شرکت کریں اور ان کے اسکولوں کو درپیش مسائل اور ان اداروں سے فارغ ہونے والی نوجوان نسل کے بارے میں ان کے زرین خیالات، سوالات، شبہات اشکالات، اضطراب اور ابہامات براہِ راست سنیں۔ ہم دونوں نے اس فکر انگیز نشست میں شرکت کی اور اسکولوں سے وابستہ نہایت مخلص، دین دار، صاحب ایمان خواتین وحضرات کے خیالات سنے۔ ان سب کا مشترکہ موقف یہ تھا کہ ہم اپنے اسکولوں میں اسلامی طرز زندگی، اسلامی تعلیمات، اخلاقیات، تجوید قرآن، حدیث، سب کچھ کا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود نتائج حوصلہ افزاء نہیں ہیں۔ ہمارے اسکولوں سے فارغ ہونے والے بچوں کا آئیڈیل مغرب ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کے حوالے سے بہت زیادہ متحرک ہوتے ہیں اور ان کو منزل پاکستان سے باہر ہی نظر آتی ہے ہم اس مسئلے کو کیسے حل کریں؟ ہمارے بہترین ماحول اور بہترین اسلامی تربیت کے باوجود بچوں میں یہ خیالات کیوں پیدا ہوجاتے ہیں؟

یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب طویل ہے مختصر نہیں۔ جدید اسکول کا نظام کہاں سے آیا ہے اس کی مابعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے؟ اس کے مقاصد واہداف کیا ہیں؟ اس کا نصاب کس بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے؟ اس کی تاریخ کیا ہے اور ان اداروں کے قیام کے لیے جبر کیوں کیا گیا؟ بچے پر نماز سات سال میں فرض ہوتی ہے لیکن اسکول میں بچے کا داخلہ اس وقت کیوں ہوجاتا ہے جب وہ ماں کے

پیٹ میں ہوتا ہے؟ خدا کی عبادت بچہ سات سال میں شروع کرتا ہے مگر معدہ اور معاش کی عبادت ماں کے پیٹ سے شروع کردیتا ہے آخر کیوں؟ یہ جبر لوگوں کے لیے اس قدر فطری، حقیقی اور قابل قبول کیوں ہے

☆ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی

قرآن نے حکم دیا ہے مائیں مکمل دوسال تک بچوں کو دودھ پلائیں مگر اس عمر سے بھی پہلے بچے کو مونٹیسری میں داخل کرادیا جاتا ہے۔ یہ جبر کون مسلط کررہا ہے؟ جدید سیکولر تعلیم کے اساسی مفکرین روسو [Rousseau]، مِل [Mill]، ولیم جیمز [William James] جان ڈیوی [John Dewey]، گیٹوز [Gatos] اور فوکالٹ [Foucault] نے اس موضوع پر کیا لکھا ہے؟ کیا جدید تعلیمی نظام کے ہتھیار ابلاغ عامہ کے اوزار ہیں یا تباہی و بربادی کے آلات [The weapons of Mass Instruction or Mass Destruction]، ان فلسفیانہ مباحث کو ایک نشست یا ایک مضمون میں بیان کرنا محال ہے لیکن اس سوال، تشویش اور فکرمندی کا مختصر سا جواب دینے کے لیے راقم الحروف نے انگریزی اسکولوں میں پڑھائی جانے والی دو اہم کتابوں کے بعض مضامین، کہانیوں کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے ممکن ہے اس جائزے میں ان سوالوں کا کوئی جواب مل سکے۔ روشنی کی ایک لکیر بھی گھُپ تاریک رات میں ہزاروں چراغوں کا متبادل ہوتی ہے۔ اس جائزے کو ایسی ہی ایک لکیر سمجھیے۔

Nutty as Noodle Stories

کراچی کے وہ اسکول جہاں Adexcle System کے تحت تعلیم دی جاتی ہے تیسری جماعت کے بچوں کو انگریزی ادب کی تعلیم دینے کے لیے ایک کتاب Nutty as Noodle stories کو نصاب میں شامل کیا گیا ہے یہ کتاب بھارت، ایشیا اور پوری دنیا میں پڑھائی جاتی ہے۔ Pie Corbett کی کتاب کی پہلی کہانی کا عنوان ہے Daft Jack احمق، نادان، بدھو جیک۔ جیک ایک غریب ماں کا بیٹا تھا جو گھروں میں کام کرکے اپنی گزراوقات کرتی مگر اس کا بیٹا روزانہ صبح کے وقت گھر کے دروازے پر بیٹھ جاتا اور گھاس چباتا۔ سہ پہر کو وہ ندی پہ بیٹھ کر مچھلیوں سے دل بہلاتا اور رات کو تاریک آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا، یہی اس کی مصروفیت تھی۔ ایک دن اس کی ماں نے اس سے کہا کہ یہ سستی، نکماپن ختم کرو اور کام کے لیے نکلو تاکہ اپنی خوراک کا بندوبست کرسکو۔

اگر تم نے ایسا نہ کیا تو واپس اس گھر کا رخ نہ کرنا۔ اگلے دن نادان جیک کام کی تلاش میں نکلا اس کی ملاقات ایک کسان سے ہوئی اس نے کسان کا ہاتھ بٹایا شام کو کسان نے اس کی شدید محنت کے معاوضہ میں ایک پینی کا سکہ دیا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ آج تو میری ماں بہت خوش ہوگی۔ واپسی کے سفر میں وہ ندی کے پاس رکا اور مچھلیوں کا نظارہ دیکھنے ندی پر جھکا۔ اس کے ہاتھ میں رکھا ہوا سکہ ہاتھ سے پھسل کر ندی میں جا گرا وہ سکے کی تلاش میں ندی کی تہہ تک اترا مگر سکہ ہاتھ نہ آیا وہ مایوس ہو کر گھر کی طرف چلا اسے یقین تھا کہ اس کی ماں سکے کی گمشدگی کا سن کر بالکل خوش نہیں ہوگی وہ مچھلی کی طرح پانی میں تر بہ تر تھا دن بھر کی محنت کا ثبوت ماں کے سامنے پیش کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا ماں اسے دیکھتے ہی چلائی او احمق لڑکے تمہیں سکہ اپنی جیب میں رکھنا چاہیے تھا۔ جیک نے جواب دیا امی معاف کر دیجیے اگلی مرتبہ غلطی نہیں ہوگی میں اس نصیحت کو یاد رکھوں گا۔ اگلے دن وہ کام کے لیے نکلا تو اسے ایک کسان ملا جس کے پاس گایوں کا گلہ تھا اس نے کسان کا ہاتھ بٹایا۔ شام کے وقت کسان نے اس کی مشقت کے صلے میں اسے دودھ کا ایک جگ دیا۔ جیک کو ماں کی نصیحت اور اپنا وعدہ یاد تھا لہٰذا اس نے نہایت احتیاط اور ذمہ داری سے دودھ کا جگ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج اس کی ماں بہت خوش ہوگی لیکن گھر پہنچتے پہنچتے دودھ جیب سے بہہ کر اس کی ٹانگوں سے رسنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی ماں ہرگز خوش نہیں ہوگی اس کی پتلون دودھ سے تر بہ تر ہو رہی تھی اور دن بھر اس نے جو مشقت کی تھی اس کا ثبوت دکھانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا بس یہی دودھ سے گیلی پتلون تھی۔ ماں اسے دیکھتے ہی چلائی اے احمق تمہیں دودھ کے جگ کو اچھی طرح ڈھانک کر اپنی قمیض کے اندر رکھ کر لانا چاہیے تھا۔ (You should (have wrapped up the jug and carried it under your shirt، جیک نے پھر معذرت پیش کی اور کہا کہ آئندہ میں اس بات کا خیال رکھوں گا (سوال یہ ہے کہ بچہ احمق ہے یا ماں بھی احمق ہے۔ دودھ کے جگ کو قمیض کے اندر رکھ کر کیسے لایا جا سکتا ہے؟) اگلے دن جیک پھر کام کی تلاش میں باہر نکلا۔ اسے نان بائی ملا اس نے روٹی کے لیے آٹا گوندھنے کا کام اس کے سپرد کیا۔ شام کے وقت جیک کی سخت محنت مشقت کے معاوضے میں نان بائی نے اسے بلی کا ایک بچہ دیا۔ جیک کو ماں سے کیا گیا اپنا وعدہ یاد تھا اس نے بلی کے بچے کو نہایت احتیاط سے لپیٹ کر اپنی قمیض کے اندر رکھ لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو اس کی ماں ضرور اس سے خوش ہوگی لیکن بلونگڑا قمیض کی اندھیری کال کوٹھری میں ناخوش تھا۔ اسے جیک کی قمیض کے اندر رہنا نہایت مضحکہ خیز لگا۔ بلونگڑے نے

غریب جیک کو پنجے مار مار کر لہولہان کر دیا۔ اس سے پہلے کہ جیک گھر پہنچتا بلونگڑا چھلانگ مار کر راستے میں ہی بھاگ نکلا۔ جیک کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کی ماں بہت ناراض ہو گی۔ ماں نے جیک کو جیسے ہی دیکھا چلائی او گدھے لڑکے بلونگڑے کو رسی کے ٹکڑے کے ساتھ باندھنا چاہیے تھا پھر تم اسے اپنے ساتھ ساتھ چلا کر لے آتے۔ جیک نے حسبِ معمول معذرت پیش کی اس نصیحت کو یاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اگلے دن وہ پھر کام کی تلاش میں نکلا اسے قصائی نے کچھ کام دیا شام کے وقت اس کی محنت کے معاوضے میں قصائی نے اسے گوشت کا ٹکڑا دیا جیک کو ماں کی نصیحت اور اپنا وعدہ یاد تھا۔ اس نے ایک رسی کو گوشت کے گرد لپیٹا اور گوشت کو بلی کے بچے کی طرح رسّی سے کھینچتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو اس کی ماں یقیناً خوش ہو گی۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ بہت سے کتے اس کا پیچھا کرنے لگے وہ گوشت کھانا چاہتے تھے وہ تمام راستے گوشت نوچ نوچ کر کھاتے رہے جب جیک گھر پہنچا تو رسی کے آخری سرے پر کچھ نہیں بچا تھا اور اس کے ٹخنے زخمی ہو گئے تھے۔ اس نے جان لیا کہ اس کی ماں ہرگز خوش نہیں ہو گی۔ جیسے ہی ماں نے جیک کو دیکھا زور سے چلائی احمق گوشت اپنے کندھے پر رکھ کر لانا چاہیے تھا تا کہ کتے گوشت نہ کھا سکتے (You should have carried the meat on your shoulders then the dogs would not have been able to eat it.) (اس کی عقل مند ماں کا یہ مشورہ خود احمقانہ ہے کیا گوشت کندھے پر رکھ کر لایا جاتا ہے؟) جیک نے حسب معمول معذرت کی ماں کی نصیحت کو اپنے پلے باندھنے اور اس پر عمل کا وعدہ کیا۔ اگلے دن وہ کام کی تلاش میں نکلا اسے شہد جمع کرنے والا ملا جیک نے چھتوں سے اس کے لیے شہد جمع کیا دن کے اختتام پر شہد والے نے اسے اپنا بوڑھا ناکارہ گدھا سخت محنت کے معاوضے میں دیا جیک نے گدھا لیا اور ماں کی نصیحت اور اپنے وعدہ پر عمل کرتے ہوئے گدھے کو اپنے کاندھے پر اٹھالیا اور گھر کی طرف چل دیا گدھے کی ٹانگیں ہوا میں لہرا رہی تھیں جیک اسی حالت میں چلتا رہا اور گدھا زوردار طریقے سے ڈھینچوں ڈھینچوں کر رہا تھا۔ راستے میں ایک بہت امیر آدمی کا گھر تھا جو اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا تھا اس کی بیٹی بہت خوبصورت تھی لیکن اپنی ماں کے انتقال کے بعد سے مسلسل اداس تھی اس نے ماں کے مرنے کے بعد اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا وہ ہمیشہ غم میں ڈوبی رہتی ڈاکٹروں نے اس کے باپ کو بتایا تھا کہ وہ صرف اسی وقت کچھ بولے گی جب کوئی اسے ہنسا سکے اس غم زدہ لڑکی نے گھر سے باہر شور شرابے کی آواز سنی تو کھڑکی سے جھانکا۔ سڑک پر عجیب تماشہ تھا جیک کے کاندھے پر ایک گدھا لدا ہوا تھا یہ منظر دیکھ کر اس

کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا اور مسرت کا چشمہ پھوٹ نکلا وہ مسلسل اور مستقل ہنسے جارہی تھی وہ بھاگ کر اپنے ابو کے پاس گئی اور اس پرلطف منظر کا ذکر کیا۔لڑکی کا باپ اس واقعہ سے بے انتہا خوش ہوا کہ اس کی بیٹی نے ہنستے ہی بولنا شروع کر دیا لڑکی کے باپ نے فیصلہ کیا کہ وہ اس لڑکے کو اپنی بیٹی کا شوہر بنائے گا جس نے اس کی اداس بیٹی کو خوش کر دیا تھا۔لڑکی کے باپ نے اپنی بیٹی جیک کے سپرد کر دی جیک گدھے پر اپنی بیوی کو بٹھا کر گھر لے گیا اس شام بھی جیک کی ماں اس کا انتظار کر رہی تھی اس کا اندازہ تھا کہ جیک آج بھی کوئی احمقانہ کام کر کے آئے گا اور اس کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہو کر رہے گا وہ اس کو ایک زوردار سبق سنانے پر تیار تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ جیک ایک گدھا لے کر آ رہا ہے اور گدھے پر ایک نہایت خوبصورت لڑکی سوار ہے تو اس کی ماں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا۔اس دن سے جیک کی ماں نے جیک کو کبھی احمق جیک نہیں کہا۔

اس کہانی میں بچے کے لیے کئی اسباق مخفی ہیں جو ہماری تہذیب،علمیت،تاریخ،روایات اور اقدار سے متصادم ہیں:

(۱) روایتی تہذیبوں میں احمق نادان معذور بدھو بچوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ان کی معذوری نادانی کو لعنت ملامت کا نشانہ نہیں بنایا جاتا ان سے خصوصی محبت کا سلوک کیا جاتا ہے آج بھی روایتی معاشروں میں خاندان کے سب سے کم زور،معذور اور احمق بچے کو سب سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔اس کو تذلیل،تضحیک،تمسخر کا نشانہ نہیں بنایا جاتا کیونکہ وہ خلقی طور پر کم زور ہوتا ہے اور زندگی کی دوڑ میں صحت مند لوگوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا ایسے بچوں کے ساتھ صرف ماں ہی نہیں خاندان اور خاندان سے باہر بھی ہر شخص خصوصی توجہ اور محبت کا برتاؤ کرتا ہے۔ان پر ضرورت سے زیادہ بوجھ اور ذمہ داریاں بھی نہیں ڈالی جاتیں۔

(۲) کم زور اور احمق بچے کی خاص تربیت کی جاتی ہے اس کو پیار و محبت سے سمجھایا جاتا ہے اور اس کی غلطیوں کی اصلاح نہایت تدبر،فہم اور شفقت سے کی جاتی ہے یہ عجیب ماں ہے جو اسے روزانہ ذلیل کرتی ہے اور بچے کو جو سبق دیتی ہے اس کے ساتھ یہ نہیں بتاتی کہ یہ سبق صرف اس طرح کی صورت حال میں کار آمد ہے لیکن تم اس سبق کو دوسری جگہوں پر استعمال نہ کرو وہ بچے کو یہ سمجھا سکتی تھی کہ جس کے یہاں کام کرو جب وہ معاوضے میں کچھ دے تو اس سے پوچھ لو کہ میں اسے کیسے لے کر جاؤں؟

(۳) ایک نادان احمق بچہ بھی اتنا احمق نہیں ہوتا کہ وہ دودھ کو جیب میں ڈال دے اور بلونگڑے کو

قمیض کے اندر رکھ کر چھپائے جسم کے ساتھ چمٹالے اور خود کو اس سے زخمی بھی کرائے۔ بچے کی حماقت انگیزی بہت زیادہ افسانوی ہے فی الحقیقت بچہ اگر اتنا ہی احمق تھا تو اس پر غصے کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔

(۴) ماں نے بچے کو جو اسباق دیے وہ خود احمقانہ ہیں۔ دودھ کے جگ کو قمیض کے اندر رکھ لو، گوشت کو کندھے پر رکھ کر لاؤ، عملی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا دونوں طریقے نہایت غلط ہیں۔ کہانی نویس نے ماں کو بھی احمق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۵) بچہ اتنا بے وقوف ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے کام صحیح طریقے سے نہیں کر سکتا لیکن زندگی کا سب سے مشکل کام یعنی شادی کا فیصلہ اس نے ایک لمحے میں کر لیا۔ اپنی ماں سے مشورہ بھی نہیں کیا اجازت بھی نہیں لی شادی کی تقریب بھی منعقد نہیں ہوئی خاندان کے لوگوں سے کوئی مشورہ، کوئی رائے کچھ نہیں کیا گیا۔

(۶) لڑکی کا باپ جو امیر تھا اس نے بھی یہی سوچا کہ یہ احمق لڑکا ہی میری لڑکی کو خوش رکھ سکے گا اور اس کے اشارے پر چلتا رہے گا لہٰذا اس نے لڑکے کے خاندان، حسب نسب کام، کاروبار، ماں باپ ، رہائش کے بارے میں کچھ پوچھنے، دیکھنے، سوچنے، کی زحمت گوارا نہ کی۔ لڑکی کا باپ ایک جانب اتنا عقل مند ہے مگر اس نے اپنے کسی عزیز دوست پڑوسی سے مشورہ نہیں کیا نہ بچی کی شادی میں کسی کو مدعو کیا۔ اچانک سڑک پر جانے والے ایک نا معلوم لڑکے سے خوش ہو کر اپنی قیمتی متاع لڑکی کا ہاتھ اس احمق لڑکے کے ہاتھ میں تھما کر گدھے پر بیٹی کو ساس کے گھر جانے کی اجازت دے دی اتنی تکلیف بھی نہیں کی کہ بچی کے سسرال تک چلا جاتا کہ یہ احمق داماد راستے میں گھر پہنچنے سے پہلے میری بیٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔

(۷) لڑکے کی ماں نہایت سخت تھی مگر جیک کو ماں کی اجازت کے بغیر شادی کرتے ہوئے نہ شرم آئی نہ کوئی فکر ہوئی۔ وہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اپنی بیوی کو ماں کی اجازت کے بغیر اس کے گھر لے گیا۔

(۸) اس کی ماں اس قدر لالچی تھی کہ اس نے جب دیکھا کہ جیک ایک خوبصورت لڑکی لے آیا ہے تو اس سے پوچھنے کی زحمت تک گوارا نہ کی کہ احمق یہ لڑکی کون ہے کہاں سے لایا ہے، کیوں لایا ہے اور کس کی اجازت سے۔ تو اتنا احمق ہے کہ کچھ کماتا نہیں ہے تجھے تو میں گھر سے نکال رہی تھی اب تو میری غربت میں ایک لڑکی بھی لے آیا ہے یہ مفلسی میں گیلا آٹا والا معاملہ ہے لیکن ماں نے سوچ لیا کہ لڑکی امیر گھر کی ہے اپنے شوہر کا خیال رکھے گی اور میرا بھی خیال رکھے گی۔ اس لڑکی پر میرا

احسان ہے کہ میں اگر اس بیٹے جیک کو نہ جنتی تو یہ اداسی میں گھٹ کر مر جاتی ۔ میرے بیٹے کی بے وقوفی اس بدقسمت لڑکی کے لیے خوشیوں کا پیغام لائی ہے ۔ میرا بیٹا تو خوش قسمت ہے۔

(۹) کہانی میں بچوں کو جو پیغام دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ زندگی کا مقصد کمانا اور کھانا ہے۔ جو کمانے کے قابل نہیں وہ عزت کے قابل نہیں اس کی بے عزتی کرنا جائز ہے بلکہ اسے گھر سے نکال دینا چاہیے۔ کسی احمق بے وقوف بچے کو گھر میں رکھ کر کھلانا پلانا احمقانہ بات ہے جو اپنا بوجھ خود نہیں اٹھا سکتا اس کا بوجھ ماں باپ گھر والوں کو بھی نہیں اٹھانا چاہیے ۔ جدید مغرب کا یہ تصور جو انسان نے اختیار کیا ہے جانور بھی اس سے بہتر تصور رکھتے ہیں مثلاً افریقہ کے جنگلوں میں ہاتھیوں کے غول کی رفتار کا تعین غول کا سب سے کم زور ہاتھی کرتا ہے۔ اس کی رفتار کے مطابق تمام ہاتھی اپنی رفتار کم کر لیتے ہیں اجتماعیت کی خاطر ایک کم زور ہاتھی کے لیے پورا غول قربانی دیتا ہے۔ چیتے کی مادہ بچے دیتی ہے تو چیتا اپنے بھٹ میں نہیں جاتا وہ باہر بیٹھ کر اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے۔ اندر صرف ماں اور بچے ہوتے ہیں وہ ماں کے لیے شکار تلاش کر کے لاتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ وہ ایک دن اس مشقت محنت سے تنگ آ کر چپکے سے غائب ہو جائے۔ وہ اپنا فرض ادا کرتا ہے اپنی بیوی کی جدائی برداشت کرتا ہے اپنے خاندان کو تنہا چھوڑنا اس کی فطرت کے خلاف ہے مگر اس کہانی میں ماں جیسی ہستی کو اس قدر کمتر درجے پر دکھایا گیا ہے جب کہ ماں کی محبت دنیا کی ایسی محبت ہے کہ رسالت مآبؐ نے جب بندوں سے اللہ کی محبت کی گہرائی کو بیان کیا تو اللہ کی محبت کو ماں کی محبت کے ذریعے بیان کیا فرمایا کہ اللہ بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت رکھتا ہے۔ ایک اور حدیث میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنے بندوں کے لیے اس سے زیادہ پیار اور رحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچے کے لیے **للہ ارحم لعبادہٖ من ھذہٖ بولدھا** (صحیح بخاری و مسلم) اور ایک انسان کی ماں کی محبت کیا ہوتی ہے؟ اسے محسوس کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جانور کی ماں تک اپنی اولاد سے ایسی محبت کرتی ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہمارے گھر میں ایک مرغی تھی اچانک بیمار ہوئی دبلی ہونے لگی طبیعت اس کی بگڑتی چلی گئی اس نے انڈے دینے شروع کیے وہ ہم نے کھائے آخری انڈہ دیتے ہوئے وہ بطخ کے گھر کی طرف چلی گھسٹتی لڑکھڑاتی ہوئی وہاں پہنچی آخری انڈہ اس نے بطخ کی دہلیز پر دے کر اپنے انڈے کو بطخ کے سپرد کر دیا اور یہ فرض ادا کرنے کے بعد وہیں اپنی جان دے دی۔ بطخ اسے اپنا انڈہ سمجھ کر گھر میں لے گئی پھر بطخ بھی کئی انڈے دے رہی تھی۔ بچے پیدا ہوئے ان میں مرغی کا بچہ بھی شامل تھا

بطخ بچوں کو تیرنے کے لیے پانی میں لے جاتی تو مرغی کا بچہ تیرنے کے بجائے بطخ کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا بطخ اسے اپنا ہی بگڑا ہوا بچہ سمجھتی جو پانی سے خوف کھاتا ہے ایک مرغی موت کا اندازہ کرتے ہی اپنے مستقبل کو ایک محفوظ ہاتھ میں منتقل کرنا چاہتی ہے یہ ماں کی محبت ہے مغرب اور Edexcle ہمیں کس قسم کی ماں سے آگاہ کر رہا ہے؟

لبرل ازم اور سرمایہ دارانہ نظام کے معاشی اصولوں کا سنہرا اصول ہے کہ Each according to his ability کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت و استعداد کے مطابق رزق ملنا چاہیے۔ جبکہ سوشلزم اس اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق ملنا چاہیے کہ تمام انسان برابر تو ہیں مگر صلاحیتوں میں برابر نہیں ہیں۔ Each according to his need لہٰذا اجتماعیت کو کم زور افراد کے لیے قربانی دینا چاہیے۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوق اور اس کے خاندان بنی آدم یعنی انسان کی خدمت ہر مسلمان کا فرض ہے کیونکہ تمام انسان اللہ کا کنبہ ہیں **الخلق عیال اللّٰہ** جو جس کے جتنا قریب ہے اس کی کفالت اس کی اخلاقی مذہبی شرعی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی کمانے کے قابل نہیں ہے تو کمانے والوں کی انفرادی، اجتماعی، گروہی، معاشرتی، خاندانی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے عزیز کا اور اجنبی کا بھی خیال رکھیں اللہ تعالیٰ تو قیامت کے دن بندے سے پوچھے گا کہ میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ جواب میں انسان کہے گا اے اللہ آپ کیسے بھوکے پیاسے ہو سکتے ہیں؟ تو جواب ملے گا میرا فلاں بندہ بھوکا تھا فلاں پیاسا تھا تم نے اس کا خیال نہیں رکھا۔ اسلام اس نقطۂ نظر کا حامی ہے حدیث میں ماں کی محبت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی محبت ستر ماؤں کی محبت سے زیادہ ہے یعنی اللہ کی محبت کے لیے مثال دی گئی تو اس دنیا سے ماں کو منتخب کیا گیا یہ کہانی ماں کی ایک نہایت گھناؤنی تصویر پیش کرتی ہے جو روایتی، مذہبی، الہامی اور اسلامی تہذیبوں کے تصور انسان، تصور عبد اور تصور ماں کے صریحاً منافی ہے یہ خالصتاً مغربی مادہ پرست ماں ہے جو پیسے کے لیے جیتی اور پیسے کے لیے مرتی ہے اس کی زندگی کا مقصد محض مادی خوش حالی اور ترقی ہے۔ چونکہ احمق بیٹے نے اپنی حماقت سے ہی مادی خوش حالی کے دروازے اپنے اوپر کھول لیے تھے لہٰذا وہ خوش ہوگئی۔ مزے کی بات یہ کہ جدیدیت (modernism) کے فلسفے اور فکر کے تحت تخلیق کردہ اس کہانی کی کتاب پر روایتی مختصر کہانیاں [Traditional Short Stories] لکھا گیا ہے یہ محض دھوکہ ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ ماضی بھی ایسا تھا اور عہد حاضر میں ہمارا حال بھی ایسا ہی ہے۔ (جاری ہے)

تعلیم و تربیت　　مدیر

دینی مدارس کب توجہ فرمائیں گے؟

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ بہت سے اسلامی اور عرب ممالک میں مسجد و مدرسہ حکومت کے کنٹرول میں ہے اور پرائیویٹ سیکٹر یا بالفاظ دیگر علماء کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ حال ہی میں مصر میں الاخوان المسلمون اور دوسری دینی جماعتوں نے جس طرح انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور حکومت بنا لی اس کے بعد دین مخالف بین الاقوامی قوتوں اور ان کی مرضی اور ایجنڈے کے مطابق حرکت میں آنے والے فوجیوں، سیاستدانوں اور دوسرے عناصر نے مستقل بنیادوں پر دینی عناصر اور اداروں کو کچلنے کا جو پروگرام بنایا ہے اس میں مساجد اور مدارس کو حکومتی تحویل میں لینا بھی شامل ہے اور اس پر عمل درآمد شروع بھی ہوگیا ہے۔

پاکستان میں بھی دینی مدارس کفار اور ان کے مقامی حمایتوں کی نظر میں مسلسل کھٹک رہے ہیں اور اس کے لیے ترغیب و ترہیب دونوں طرح کے ذرائع استعمال کیے جا رہے ہیں۔ حکومتوں کو مدارس کی اصلاح کے نام پر ڈالر بھی دیے جا رہے ہیں اور دباؤ کا حربہ بھی جاری ہے۔ اس بیرونی اور حکومتی دباؤ کا مقابلہ کرنے کی نفسیات نے دینی مدارس کا ایک ایسا دفاعی مائنڈ سیٹ بنا دیا ہے جو خود احتسابی، اصلاح اور ترقی کے لیے درکار تخلیق و تحقیق اور جدت و تنوع کے رجحانات کو بھی پس پشت ڈال رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ دینی مدارس متوقع خدشات سے ڈر کر اپنا طریق کار بدل لیں لیکن ہم مدارس کے ہمدرد اور بہی خواہ ہونے کی وجہ سے ان سے درخواست کرتے ہیں کہ:

- دینی مدارس اپنے ہاں احتساب اور اصلاح و ترقی کے لیے خود فعال ادارے بنائیں اور بیرونی محرکات سے قطع نظر، اپنی مرضی اور ارادے سے منظم غور و فکر کے اور اصلاح و ترقی کے لیے اقدامات خود تجویز کریں اور ان پر عمل درآمد بھی خود کریں۔

- کوئی برا اور سخت وقت آنے سے پہلے اس کی پیش بندی اور حفاظتی اقدامات کرنا بزدلی نہیں، عقل و حکمت کا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔

اگر پانچوں دینی وفاق مدارس کی اصلاح وترقی کے لیے دو دو آدمی نامزد کریں تو دس فاضل ارکان پر مشتمل ایک ایسی کمیٹی یا کمیشن تشکیل دیا جاسکتا ہے جو اس غرض کے لیے تجاویز تیار کرے اور پانچوں وفاقوں کے صدور وسیکرٹری حضرات پر مشتمل ''اتحاد مدارس دینیہ'' سے اس کی منظوری حاصل کر کے اس پر عمل درآمد کرائے۔

ابتداءً ہم مجوزہ کمیٹی کے غور وفکر کے لیے دو نکاتی ایجنڈا دینی مدارس کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

ایک: یہ کہ دینی مدارس کی تعلیم اور نصاب ونظام سے فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

دوسرے: مدارس کے فضلاء کی خدمات کو صرف مدارس ومساجد تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ معاشرے اور ریاست کو ان کی خدمات سے استفادے کا موقع بھی دیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ نصاب کو کچھ وسعت دی جائے اور مدارس کی اسناد کو حکومت کے متعلقہ اداروں سے منظور کرایا جائے۔

ہم ان دونوں نکات کے لیے تفصیلی تجاویز اور لائحہ عمل بھی تجویز کر سکتے ہیں اور دینی مدارس کی اصلاح وترقی کے لیے مزید نکات بھی پیش کر سکتے ہیں لیکن ہم عمداً ان امور کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے اور اہل مدارس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری درخواست پر غور فرمائیں اور اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ دوسروں کی مداخلت سے پہلے خود مدارس کی اصلاح وترقی کے لیے سوچیں اور ضروری فیصلے کریں اور اس طرح سیلاب آنے سے پہلے اپنے حفاظتی پشتے مضبوط کرنے کے لیے اقدامات کریں۔

ہم نے یہ تجاویز اس لیے دی ہیں کہ ہم دینی مدارس اور علماء کرام سے محبت کرتے ہیں، ان کے خیر خواہ ہیں اور ان کے کام کو مزید بہتر اور موثر دیکھنے کے متمنی ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

مولانا وحید الدین خاں کی فکر کا تجزیہ

مولانا وحید الدین خاں کی فکر پر سید خالد جامعی صاحب کا علمی محاکمہ والا مضمون چونکہ طویل تھا اس لیے البرہان صرف اس کی تین ابتدائی قسطیں (شمارہ نومبر ودسمبر ۲۰۱۳ء و جنوری ۲۰۱۴ء) شائع کر سکا۔ مکمل مضمون کے لیے سید خالد جامعی صاحب سے شعبہ تصنیف وتالیف

وترجمہ، جامعہ کراچی سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

ہمارا دینی تناظر　　　　پروفیسر ملک محمد حسین ☆

فرقہ واریت کی وجوہات اور ان کا حل

پاکستان اس وقت فرقہ واریت کا گڑھ بن چکا ہے۔ تقریباً ہر مسجد ایک علیحدہ فرقے کی علم بردار ہے اور مسجدوں کی تعداد ہزاروں نہیں لاکھوں میں ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے چار اینٹیں رکھ کر ایک الگ مسجد کھڑی کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح ایک نیا فرقہ جنم لے لیتا ہے اگر چہ ظاہری بورڈ دیو بندی، بریلوی، شیعہ سنی یا اہل حدیث کا لگا ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہر سال دینی مدارس سے ہزاروں طلبہ آخری سند لے کر فارغ التحصیل ہو رہے ہیں۔ تعلیم مکمل کر کے زندگی کا پہلا مسئلہ روزگار کا ہوتا ہے اور ہمارے ان نوجوانوں کو سوائے مسجد کی امامت، خطابت اور فرقہ واریت کی بنیاد پر اپنا ایک جتھا بنانے کے اور کوئی کام آتا نہیں ہے لہذا خود روزگاری (Self Employment Mode) کا طریقہ کام میں لاتے ہوئے وہ کوئی بستی تلاش کرتے ہیں جہاں یا تو قرب و جوار میں کوئی مسجد نہ ہو اور اگر ہو تو اُن کے نظریات کے برعکس کسی اور فرقے کی ہو تو وہ اپنا ڈول ڈال دیتے ہیں۔ بس اس کام کے لیے چند پر جوش ساتھی، ایک لاؤڈ سپیکر اور اِدھر اُدھر کوئی خالی قطعہ زمین درکار ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کا کام آسانی سے چل پڑتا ہے کیونکہ کافی لوگ مسجد کی تعمیر میں چندہ دے کر اپنا گھر جنت میں بنوانا چاہتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ اُن کے اس نیک جذبے سے شاید انتشار فی الامت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اگر یہ پہلو دیکھیں تو فرقہ واریت بنیادی طور پر پیٹ کا مسئلہ ہے۔ یہ بات ہم نے عوامی سطح (گراس روٹ لیول) کے حالات دیکھ کر کی ہے ذرا اونچی اور شاید دینی مدارس کی سطح پر بھی فرقہ واریت بنیادی طور پر معاشی ضروریات اور معاشی تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے جاری ہے۔

اگر ہم دینی حلقوں کی بلند ترین سطح پر نظر کریں تو فرقہ بندی اور مذہبی بنیادوں پر گروہ بندی کی بنیادی وجہ سیاست ہے۔ دیو بندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ مکتب فکر کے متعدد سیاسی گروہ اور سیاسی پارٹیاں ہمارے اس نقطہ نگاہ کا بیّن ثبوت ہیں۔ جماعت اسلامی جیسی غیر فرقہ واریت پر مبنی مذہبی جماعت کو بھی لوگوں نے فرقہ سمجھنا شروع کر دیا ہے یا شاید اہل جماعت کے بعض اپنے اقدامات کی وجہ سے ایسا ہوا ہے مثلاً کسی گلی محلے میں پہلے ایک مسجد موجود تھی اور جماعت کے بعض پُر جوش لیکن حکمت سے عاری کارکنوں نے اپنی ایک مسجد کھڑی کر دی اور اس کے چہرے پر جماعت اسلامی لکھ بھی دیا تو فرقہ واریت کا

تاثر تو اُبھرے گا۔ ہماری ان معروضات کا مقصد یہ ہے کہ فرقہ واریت کی ایک مضبوط وجہ سیاسی بھی ہے۔

فرقہ واریت کی ایک وجہ نمایاں ہونے کا جذبہ، مختلف نظر آنے کا شوق اور سماج میں اہمیت حاصل کرنے کی بیماری بھی ہے جو ہمارے بہت سارے "علماءِ کرام" کو لگی ہوئی ہے۔ آپ کو کئی علامہ صاحبان نظر آئیں گے جو تنہا پرواز کے شوقین ہیں۔ سیاست اُن کا پیشہ نہیں ہے، معاش اُن کا مسئلہ نہیں ہے لیکن دانشوری بگھارنا ان کی مجبوری ہے۔ اب یہ دانشوری تب بکے گی جب یہ دوسروں کی دانشوری سے مختلف نظر آئے گی لہٰذا نکتہ آفرینی، منطقی موشگافیاں اور لفاظی کا سہارا لیں گے۔ ہماری مراد اس سے یہ ہے کہ فرقہ واریت ایک سماجی مرض بھی ہے۔

ہم نے فرقہ واریت کے مسئلہ پر بہت غور کیا کہ فرقہ واریت کی کوئی اسلامی اور دینی بنیاد بھی مل جائے لیکن ناکامی ہوئی۔ ہاں مختلف مسائل پر اختلاف رائے تو اہلِ علم میں ہوسکتا ہے۔ خود صحابہ کرام میں بھی مختلف اشوز پر اختلاف رائے تاریخ کا حصہ ہے لیکن اس سے فرقے جنم لیں یہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ دین کی اساسیات میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا اور نہ ہی معقول سوچ کے لوگوں میں ہوسکتا ہے۔

تاریخی طور پر ہند و پاکستان کے دینی مدارس فرقہ واریت کے علمبردار رہے ہیں اور ہیں۔ ان مدارس کے مختلف الرائے ہونے کی کوئی علمی وجہ بھی ہوسکتی ہے لیکن ان کے توسط سے مسلم اُمہ کو تقسیم کرنے کا عمل بھی بنیادی طور پر معاشی، سیاسی اور سماجی ہے۔ ان مدارس کے اربابِ حل وعقد شاید (خاکم بدہن) اللہ کے خوف سے اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے اس قدر عاری ہو چکے ہیں کہ مسلمانوں کو تقسیم کر کے کمزور کرنے اور فرقہ واریت سے تنگ آئے ہوئے نوجوانوں کا دین اسلام سے برگشتہ ہونے کا انہیں کوئی احساس نہیں ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ لوگ جمعہ کے روز مساجد میں اس وقت آتے ہیں جب مولوی صاحب کی تقریر ختم ہونے کے قریب اور خطبے کی اذان ہونے والی ہو۔ لوگ ان فرقہ باز مولویوں کے قصے کہانیاں نہیں سننا چاہتے، ہاں جو علماءِ کرام قرآن وحدیث پر مبنی علم وحکمت سے لبریز ٹھوس بیان فرماتے ہیں، ان کی مساجد میں لوگ پہلی اذان پر ہی کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہفتہ وار خطبہ جمعہ کی شکل میں مسلمانوں کی مسلسل تعلیم کا جو اہتمام کیا ہے وہ یہ فرقہ باز مولوی ناکام بنا رہے ہیں۔ ذرا تصور کریں کہ ایک مسلمان سال بھر میں دین کی تعلیمات سے بھرپور باون (۵۲) خطبات سُنے تو اس کی دینی معلومات اور دینی شعور کا لیول کیا ہو جائے گا:

پس چہ باید کرد

فرقہ واریت کا رونا تو سب روتے ہیں اور ہم نے بھی اپنی اس مختصر تحریر میں کافی آہ و بکا کر لی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا حل کیا ہے:

ہماری رائے میں اس کا حل اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی اسلامی شقوں کو پوری قوت اور پورے اخلاص کے ساتھ نافذ کرنے میں ہے۔ قرارداد مقاصد اور دستور کی شق نمبر 31 کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہم درج ذیل تجاویز دیتے ہیں۔

۱۔ اسلامی نظریاتی کونسل وفاقی وزارت مذہبی امور اور صوبائی وزارت ہائے مذہبی امور کو ملک بھر کی مساجد کو ریگولیٹ کرنے کا ایک تفصیلی لائحہ عمل بنا کر دے جسے پارلیمنٹ منظور کر کے قانون کی شکل دے۔

۲۔ ضلعی سطح پر مذہبی امور کا محکمہ قائم کیا جائے جو اسلامی نظریاتی کونسل کے دیے گئے لائحہ عمل اور پارلیمنٹ سے پاس شدہ قانون کی روشنی میں مساجد کا انتظام و انصرام کرے۔

۳۔ معاشرے سے مدد لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن مساجد کے انتظام و انصرام کے جمیع مصارف حکومت مہیا کرے۔

۴۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں آئمہ مساجد کی کم از کم مذہبی تعلیمی قابلیت طے کی جائے۔ آئمہ مساجد کی تقرری ضلعی سطح پر قائم علماء کا بورڈ کرے۔ علماء کی تنخواہ اور دیگر مراعات ضلعی حکومت کی ذمہ داری ہو۔ آئمہ مساجد کے عزل و نصب کا اختیار علماء کے ضلعی بورڈ کے پاس ہو۔

۵۔ علماء کے ضلعی بورڈ میں علم اور تقوٰی کی بنیاد پر جید علماء شامل ہوں۔ ان کا انتخاب فرقہ واریت پر مبنی نہ ہو۔ علماء کے ضلعی بورڈ میں شامل علماء کا انتخاب دیے گئے معیار کے مطابق ضلعی محکمہ مذہبی امور کرے گا جس کی حتمی منظوری اسلامی نظریاتی کونسل دے گی۔

۶۔ صوبائی سطح پر بھی جید علماء کا ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو صوبے میں صوبائی وزارت مذہبی امور کی راہنمائی کرے گا۔ علماء کے صوبائی بورڈ کا انتخاب اور تشکیل اسلامی نظریاتی کونسل کرے گی۔

۷۔ علماء کا صوبائی بورڈ صوبے میں قائم دینی مدارس کو بھی ریگولیٹ کرے گا۔

۸۔ اسلامی نظریاتی کونسل قرآن و سنت پر مبنی دینی مدارس کے چھ سالہ کورس کا نصاب تشکیل دے

گی جو سب دینی مدارس میں پڑھانا لازمی ہوگا۔اس کے بعد تخصص کے آخری دو سالوں میں مختلف مسالک کے مدارس اپنے اپنے مسلک کی خصوصی تعلیم دے سکتے ہیں جس میں دوسرے مسالک سے نفرت اور کدورت کی باتیں شامل نہ ہوں۔نصاب کے حوالے سے صرف شیعہ اور سنی دو مسلک تسلیم شدہ ہوں گے۔

۹۔علماء کرام کا صوبائی بورڈ خطبہ ہائے جمعہ کے موضوعات اور مواد طے کرے گا جس کے ذریعے عوام الناس میں دینی تعلیمات کا فروغ اور دینی معاملات کا شعور پیدا کیا جا سکے۔شیعہ سُنی مسالک کی مساجد میں خطبہ ہائے جمعہ کے موضوعات تو مشترک ہوں گے تاہم نفس مضمون یعنی مواد میں مسالک کا خیال رکھا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ مسالک اور فرقوں پر مبنی سیاسی جماعتوں پر قانوناً پابندی لگائی جائے۔

۱۱۔اسلامی نظریاتی کونسل کی تمام قانونی سفارشات کو پارلیمنٹ میں پیش کر کے جلد از جلد قانون سازی کی جائے تاکہ یہ تاثر ختم ہو کہ حکومت قرآن وسنت کی روشنی میں قانون سازی نہیں کرنا چاہتی۔

۱۲۔انتظامی میشنری کو کرپشن اور نااہلی سے پاک کیا جائے۔عدالتی نظام جو اس وقت اینگلوسیکسن (Anglo Sexon) قانون پر چل رہا ہے اسے اسلامی نظامِ انصاف کے مطابق ڈھالا جائے اور عوام الناس کو فوری انصاف مہیا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ملک میں امن اسی سے قائم ہوگا۔

۱۳۔اسلامی نظریاتی کونسل کی مجوزہ ذمہ داریوں کے پیشِ نظر اس کے سٹاف، بجٹ اور تنخواہوں و سہولتوں میں اضافہ کیا جائے۔

۱۴۔اسلامی نظریاتی کونسل کے اراکین کی تعلیم، تصانیف اور تقوٰی کا ایک معیار مقرر کیا جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان اور چیئرمین کا انتخاب اور تقرر سپریم جوڈیشل کونسل کے دائرۂ اختیار میں لایا جائے اور انہیں ہٹانے کا بھی وہی طریقہ اپنایا جائے جو سپریم کورٹ کے جج صاحبان کے لیے مقرر ہے۔

۱۵۔ حکومت اسلامی نظریاتی کونسل کی نگرانی میں اسلامی تحقیقی کتب کی اشاعت کا ایک اعلیٰ ادارہ قائم کرے نیز شیخ زید اسلامک سنٹرز کو جو کراچی یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی میں قائم ہیں، اعلیٰ تحقیقی اداروں کی شکل میں دوبارہ منظم کرے اور ان سنٹرز کو خصوصی فنڈز مہیا کرے جو قرآن

وسنت کی روشنی میں سوشل سائنسز کے میدان میں تحقیقی اجتہادی کام کریں۔

میڈیا مدیر

الیس منکم رجل رشید؟

راجہ ظفر الحق، عرفان صدیقی اور احسن اقبال توجہ فرمائیں

حال ہی میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی ہے کہ میڈیا کو اسلامی اور پاکستانی اقدار کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس سے پیشتر یہ معاملہ سپریم کورٹ میں بھی گیا تھا کہ میڈیا کو عریانی وفحاشی سے روکا جائے لیکن کچھ نہ بنا۔ ہم جیسے بہت سے لوگ مسلسل احتجاج کر رہے ہیں کہ پاکستانی میڈیا خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کو اسلامی اصول و اقدار اور نظریۂ پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی سے روکنے کے لیے اقدامات کیے جائیں کیونکہ دنیا کا کوئی ملک اور معاشرہ آزادیٔ اظہار کے نام پر معاشرے کے اساسی اور متفق علیہ اصولوں کی دھجیاں بکھیرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ امریکہ میں بہت آزادی ہے لیکن کسی کو جمہوریت، آئین اور فیڈریشن کے خلاف بولنے کی اجازت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن پاکستانی میڈیا کا باوا آدم نرالا ہے کہ یہاں ریاست اور اس کے اساسی نظریے کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا ہو رہا ہے اور اسے کوئی چیک کرنے والا نہیں۔

ہم یہ تلخ بات کہنا نہیں چاہتے کہ کیا میڈیا مالکان اور پالیسی سازوں کے گھروں میں بہو بیٹیاں نہیں؟ یا کیا شرم وحیاء اسلام کی اقدار نہیں رہیں؟ ہم یہ بھی نہیں کہنا چاہتے کہ میڈیا یہ سب کچھ غیر اسلامی اور غیر پاکستانی قوتوں کی مہمیز پہ کر رہا ہے۔ ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ پوری حکومت بیچاری بہت مصروف ہے۔ اتنے اہم قومی کام ہیں کہ میڈیا کے خلاف شکایت سننے جیسے معمولی کام کے لیے کسی کے پاس وقت ہی نہیں۔ مرکزی وزیر اطلاعات پرویز رشید صاحب کا تو غالباً یہ ایشو ہی نہیں اور یوں لگتا ہے کہ وہ پرویز زیادہ ہیں اور رشید کم۔ ہمیں اس حکومت میں کچھ شریف آدمیوں کے نام یاد آتے ہیں جو اسلامی پس منظر رکھتے ہیں اور جن کو کچھ اسلامی اقدار کا پاس ہوسکتا ہے۔ ہم جناب راجہ ظفر الحق، احسن اقبال اور عرفان صدیقی صاحب کو متوجہ کرتے ہیں کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو کسی وقت وزیر اعظم صاحب کو اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائیں تاکہ اس ابلیسیت کو روکنے کے لیے عملاً کچھ تو ہو، خالی بیان بازی اور ہدایت جاری

کرنا یا قرارداد پاس کرنا مسئلے کا حل نہیں۔

اسلامی تحریکیں

جمیل الرحمن عباسی

تنظیم اسلامی کا منہج اور چند مغالطے (آخری قسط)

تیسرا اعتراض:

جناب محمد رشید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''تنظیم کے ابتدائی تشخیصی اور بنیادی موقف اور اعلانیہ پروگرام سے متضاد ایک اعلان ہے جسے تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے پیہم اصرار اور تکرار سے بیان کیا جاتا ہے۔ سید مودودی مرحوم ومغفور نے احیائے اسلام کے لیے جس ''عمومی تحریک اصلاح'' کا ذکر کیا ہے وہ نام نہاد ''انقلابی جدوجہد'' کا ابتدائی مرحلہ ہے جبکہ اس مجہول الاسم ''انقلابی جدوجہد'' کا تکمیلی مرحلہ وہ ہے جسے جناب ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے منہج نبوی ﷺ اور سیرت نبوی ﷺ کے اہم مرحلہ ''قتال فی سبیل اللہ'' میں اجتہاد کرتے ہوئے پُرامن احتجاجی تحریک کو ''غیر مسلح تصادم'' کے عنوان سے شد ومد اور نہایت تکرار واصرار سے قبول کرانے کی دعوت دی''۔

جواب:

امیر تنظیم اسلامی نے مولانا کی تحریک کو انقلابی کہا ہے جیسا کہ مولانا مودودیؒ کے الفاظ سے یہ بارہا ظاہر ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی محض فرد کی اصلاح کے لیے قائم نہیں ہوئی تھی بلکہ باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر دین حق کا غلبہ وقیام اول دن سے اس کا مشن تھا۔ نظام کی اس تبدیلی کے لیے قرآن کی اصطلاح اقامت دین اور ''اظہار دین الحق علی الدین کلہ'' ہے۔ جب کہ آج کی اصطلاح میں اس تبدیلی کو انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ مشن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہی انقلابی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا اپنے کام کے ابتدائی مراحل کے لیے بھی جا بجا 'انقلاب' کے لفظ کو استعمال کیا جس سے ان کے کام کا رخ بجا طور پر واضح ہوتا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ تنظیم اسلامی احتجاجی سیاست کے لیے مولانا مودودی سے دلیل نہ پکڑتی ہے نہ ان پر احتجاجی طریقہ ترک کرنے کا الزام دھرتی ہے۔ تنظیم اسلامی نے احتجاجی تحریک کا طریقہ خود 'ایجاد' کیا ہے۔ تنظیم کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ منہج انقلاب نبوی ﷺ کے آخری مرحلے مسلح تصادم

کا متبادل ہے۔ آپ احتجاجی سیاست حتی کہ ہمارے پیش کردہ منہج انقلاب نبوی ﷺ سے بھی اختلاف رکھ سکتے ہیں کہ یہ طریقہ منصوص نہیں ماخوذ ہے یعنی یہ طریقہ قرآن وسنت کی نصوص میں حرف بحرف اس طرح لکھا نہیں ہے جیسے ہم بیان کرتے ہیں بلکہ ہم نے قرآن وسنت کی نصوص، سیرت نبویؐ وصحابہؓ اور مزاج اسلامی سے اخذ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ استنباط واستشہاد میں غلطی کا امکان بہرحال موجود رہتا ہے اور اس غلطی پر تنقید کرنا اہل علم کا حق ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم یہ تنقید ٹھنڈے دل سے سنیں، سمجھیں اور اگر محسوس ہو کہ واقعتاً ہم سے کسی قسم کی غلطی ہوئی ہو تو اس کی اصلاح کریں۔ بصورت دیگر ہم اس تنقید پر اپنی وضاحت پیش کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جناب عاکف سعید صاحب نے اپنے خطاب زیرِ بحث میں فرمایا:

> ''ابتدائی طریقہ کار تو انہوں نے بڑی عمدگی سے بیان کیا لیکن آخری مراحل کو پورے طور پر واضح نہ کیا۔ اب یہ مصلحتاً بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت ان کا ذہن پوری طرح واضح نہ ہو''

امیر تنظیم، مولانا کے اس طریقے کے بارے میں کہتے ہیں کہ آخری مرحلہ ان کے ہاں واضح نہیں ہے تو یہ مولانا کے الفاظ ہی سے ظاہر ہے۔ مولانا خود اپنی تحریروں میں بار بار لکھتے ہیں کہ ایک لازمی اور طبعی نتیجے کے طور پر وہی نظام قائم ہوجائے گا جس کے لیے زمین تیار کی گئی ہوگی۔ نیا نظام حکومت تشکیل دینے کے لیے ضروری ہے کہ ''اصلاح پسند'' حکومت میں آئیں یا مولانا کے الفاظ میں انقلاب قیادت واقع ہو اس کے بغیر نظام کیسے قائم ہوگا۔ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی دعوت کے نتیجے میں عوام الناس اپنی اسلامی نظام کی پیاس کو کیسے ظاہر کریں گے اور پہلے سے قائم شدہ نظام کے محافظ کیسے اندازہ کریں گے کہ ان کا نظام چلنا مشکل ہوگیا ہے یا انقلابی لوگ ان حاکموں کو یہ حقیقت کس طریقے سے باور کرائیں گے۔ اور یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکمران اس راز کو پا ہی جائیں تو کیا اتنے حقیقت شناس واقع ہوں گے کہ کرسی چھوڑ کر صالح قیادت کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دے دیں؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کا جواب مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں نہ پا کر ہم کہتے ہیں کہ آخری مرحلے کے خدوخال انہوں نے واضح نہ فرمائے تھے۔ لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ طبعی نتیجے کے طور پر سب کچھ خود بخود ہو جائے گا۔ اسلامی انقلاب کے طریقے سے بحث کرنے والا آپ کا ایک اہم مضمون ''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' ہے۔ یہ دراصل اپریل ۱۹۴۵ء میں جماعت کے سالانہ اجتماع سے آپ کا خطاب ہے ،اس میں مولانا فرماتے ہیں:

> ''اسی طرح نظام امامت کا وہ انقلاب بھی جو آپ کی پیش نظر ہے کبھی محض دعاؤں اور تمناؤں

سے رونما نہ ہو سکے گا بلکہ اس کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ آپ اس قانون کو سمجھیں اور اس کی ساری شرطیں پوری کریں جن کے تحت دنیا میں امامت قائم ہوتی ہے‘‘۔(روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۱۶، زیرعنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

’’نیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایسے ایک (صالح) گروہ کے محض وجود میں آ جانے ہی سے نظامِ امامت میں تغیر واقع نہ ہو جائے گا کہ ادھر وہ بنے اور ادھر اچانک آسمان سے کچھ فرشتے اتریں اور فساق و فجار کو اقتدار کی گدّی سے ہٹا کر انہیں مسند نشین کر دیں‘‘۔(روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۲۷، زیرعنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

’’تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں‘‘ سے بظاہر یہ شک پڑتا ہے کہ بس اس میں اخلاق عالیہ کی تلقین کے ساتھ خوشخبری ہوگی کہ بس حکومت کا ہما آپ کے سر پر منڈلا ہی رہا ہے لیکن مولانا اخلاقیات کی عمدہ تعلیم و توجیہ کے ساتھ دوسرا رخ بھی دکھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’مجموعی طور پر انسان کی کامیابی و ناکامی اور اس کے عروج و زوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ وہ بے نیاز نہ تو مادی قوت ہی سے ہو سکتا ہے اور نہ ہی اخلاقی قوت سے، اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں یا وہ ان میں دوسروں کی نسبت کمزور ہوتا ہے اگرچہ اصلی فیصلہ کن اہمیت پھر بھی اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی طاقت کی‘‘۔(روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۱۸، زیرعنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

آگے مولانا رقم فرماتے ہیں:

’’لیکن اگر کوئی ایسا منظم گروہ موجود ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں میں باقی ماندہ انسانی دنیا پر فضیلت رکھتا ہو اور وہ مادی اسباب و وسائل کے استعمال میں بھی کوتاہی نہ کرے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قائم رہ سکے‘‘۔

یہاں تک یہ واضح ہو چکا ہے کہ مولانا کے ہاں بھی انقلابِ قیادت، ایک طبعی نتیجہ پر ہی نہ ہوگا بلکہ اس کے لیے اخلاقی طاقت کے ساتھ ساتھ، مادی طاقت سے کام بھی لینا پڑے گا اور یہ غلبہ معجزانہ انداز سے بھی نہ ہوگا بلکہ عادی قوانین ہی کے تحت ہوگا۔ اب سوال یہ ہے عادی قوانین کے تحت، مادی قوت کے استعمال کا طریقہ کیا ہو اور اس کے مراحل و لوازم کیا ہوں گے؟ ہمارے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ مولانا جیسے مدبر اور پیش بند شخص نے یا ان کے ساتھیوں نے اس مسئلے پر کبھی سوچا نہ ہو۔ نہ صرف وہاں یہ کہ سوچا

جاتا تھا بلکہ پوچھا بھی جاتا تھا۔ایسے سائلین کا ذکر مولانا اپنے الفاظ میں یوں کرتے ہیں:

''اس دور میں سب سے زیادہ جو سوال سوچنے سمجھنے والے طبقے کو پریشان کرتا تھا وہ یہ تھا کہ ۔۔۔۔۔۔۔عملاً وہ انقلاب کیسے قائم ہوگا جو ہم برپا کرنا چاہتے ہیں؟ فرض کیجیئے ہم غالب حصہ آبادی کے خیالات، ذہنیتیں، اخلاقی میعارات،سب کچھ بدل دیتے ہیں تب بھی کفر کا اقتدار خود بخود تو ختم نہ ہوگا اسے بدلنے کے لیے بہرحال کوئی عملی صورت ہی اختیار کرنا ہوگی۔۔۔۔۔۔۔ یہ سوالات اس زمانے میں بار بار میرے سامنے پیش کیے جاتے تھے''۔(تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل،۱۰۵)

تقسیم ہند سے پہلے اس مسئلے کی طرف مولانا مختلف بلکہ مختصر انداز سے روشنی ڈالتے رہے ہم ان چیزوں کو ایک ترتیب سے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

فرماتے ہیں:

''بلکہ اس جماعت کو کفر وفسق کی طاقتوں سے زندگی کے ہر میدان میں، ہر ہر قدم پر کشمکش اور مجاہدہ کرنا ہوگا اور اقامتِ حق کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دے کر اپنی محبت حق اور اپنی اہلیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ یہ ایسی شرط ہے جس سے انبیاءؑ تک مستثنیٰ نہ رکھے گئے، کجا کہ آج کوئی اس سے مستثنیٰ رہے گا''۔

(روداد جماعت اسلامی،سوم،۲۲۷،زیرعنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

''تمام اہل خیر وصلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں اجتماعی قوت پیدا کریں اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ایک ایسا نظام حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت و رہنمائی اور قیادت وفرمانروائی کا منصب مومنین صالحین کے ہاتھوں میں ہو''۔(روداد جماعت اسلامی ،سوم، ۲۱۳،زیرعنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

''اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو اصلاح سے،اضطراب کو امن سے، بد اخلاقیوں کو اخلاق صالحہ سے،اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہشمند ہو تو اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسن اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوع انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھینی جاسکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جاسکے''۔

(روداد جماعت اسلامی،سوم،۲۰۸،۲۰۹ زیرعنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

''ہمیں ایک عوامی تحریک چلانے سے پہلے ایسے آدمی تیار کرنے کی فکر ہے جو بہترین اسلامی

سیرت کے حامل ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیش نظر کام کا جو نقشہ ہے وہ یہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کریکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے۔ تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں‘‘۔

ایک ٹھوس، پائدار، اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے‘‘۔(جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ، اور لائحہ عمل صفحہ ۴۳، ۴۴)

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے ایک تحریک بہرحال مولانا کے ذہن میں موجود تھی۔اب اس تحریک کے مراحل کیا ہوں گے، اس کا بھی ایک خاکہ لازماً، مولانا اور قیادت کے ذہنوں میں بہرحال موجود تھا، ملاحظہ فرمائیں:

’’اس دوران منفرد اشخاص کو بھی اور پورے گروہ کو بھی بہت سے مراحل سے گزرنا پڑے گا اور کئی رکاوٹیں پیش آئیں گی جن سے ہر مرحلے کے حالات کے مطابق نمٹا ہوگا۔ان کی تفصیل نہ اس وقت بتائی جا سکتی ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے‘‘۔(تقریر میاں محمد طفیلؒ اجتماع الہ آباد، اپریل ۱۹۴۶ء، روداد جماعت اسلامی، چہارم، صفحہ ۳۳)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی کے اگلے کچھ مراحل ان کے ذہن میں موجود تھے لیکن وہ اس وقت ان کی اشاعت کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔اسی سے رشید صاحب کا یہ اعتراض بھی رفع ہوتا ہے کہ تنظیم اسلامی تحریک اصلاح کو نام نہاد ’’انقلابی جدوجہد‘‘ کے محض ابتدائی مرحلے میں مقید کرتی ہے، حالانکہ یہ خود اہل جماعت کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے۔

بلاشبہ یہ سعادت ڈاکٹر اسرار احمد کے حصے میں آئی کہ سیرت النبی ﷺ کے گہرے مطالعے کے بعد انہوں نے ایک مربوط منہج انقلاب پیش کیا۔ بلاشبہ آپ کی کتاب ’’منہج انقلاب نبویؐ‘‘ اِس موضوع پر ایک جامع کتاب ہے۔آپ نے بیان فرمایا کہ تحریک کے ابتدائی مراحل، دعوت، تربیت، تنظیم اور صبر محض تو نبی اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق ہی طے کیے جائیں گے۔اس دوران دعوت و تبلیغ و تربیت و تنظیم اور اس کے ساتھ امر بالمعروف اور خصوصاً نہی عن المنکر باللسان میں مشغول رہا جائے۔بعد کے مراحل میں تو نبی اکرم ﷺ نے مسلح جنگ کا راستہ اختیار کیا تھا۔لیکن چونکہ ہم جس معاشرے میں کام کر رہے ہیں اس میں مسلمان ہی مدمقابل ہیں لہٰذا یہاں پر جنگ کے بجائے نہی عن المنکر بالید کا طریقہ اختیار کیا جائے۔آپ اس کے لیے حدیث مبارکہ پیش کرتے ہیں کہ ’’تم میں سے جو کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ

سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے بدلنے کی کوشش کرے اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے''۔ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس حدیثِ مبارکہ کے اسلوب پر غور وتدبر سے یہ لازمی تقاضا سامنے آتا ہے کہ منکر کو مٹانا، اسے برا کہنا اور اسے برا سمجھ کر اس سے نفرت کرنا ہر مسلمان پر واجب اور فرض ہے۔سب سے نچلے درجے پر ہرگز قانع نہیں ہونا چاہئے، بلکہ لازم ہے کہ طاقت حاصل کرنے اور جمعیت فراہم کرنے کے لئے دل وجان سے کوشش کی جائے۔لوگوں کو تیار کیا جائے کہ منکرات کو مٹانے اور بدلنے کے لئے اپنی جانیں تک دینے کے لئے آمادہ ہوں۔جب تک طاقت حاصل نہ ہو زبان سے بھی منکر کو منکر کہنے کا عمل جاری رہے۔صاحبانِ اقتدار کو نرم وگرم طور پر اس طرف متوجہ کیا جاتا رہے۔اس دوران دل میں منکرات کے خلاف نفرت پروان چڑھتی رہے تاکہ جب ان کو طاقت وقوت کے ساتھ بدلنے کا مرحلہ آئے تو جذبات میں منکرات کے خلاف جوش وخروش کا طوفان موجزن ہو۔ایسا نہ ہو کہ کوئی مسلمان ماحول کے رنگ میں رنگا جائے۔ایسا نہ ہو کہ دل کی نفرت کم ہو اور پھر ماحول اس پر چھا جائے۔ایسا نہ ہو کہ کل وہ جس کام کو برا کہہ رہا تھا اور برا سمجھ رہا تھا آج وہ خود اس میں ملوث ہو جائے''۔(منہج انقلاب نبوی،صفحہ،۳۵۴)

احتجاجی طریقِ کار کی تائید دیگر علماء کرام بھی کرتے ہیں۔علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں:

''منکر کو روکنے کی تیسری شرط اسے روکنے کی طاقت رکھنا ہے، گویا منکر کو روکنے والا ذاتی طور پر یا اپنے ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ مل کر بالفعل یہ طاقت رکھتا ہو کہ منکر کو قوت کے ساتھ روک سکے۔۔۔منکر کو روکنے کے مسئلے میں ایک مشکل اس وقت کھڑی ہو جاتی ہے جب صاحبِ قوت واختیار یعنی حکومت ہی برائی کی مرتکب ہو تو پھر افراد اور جماعتیں اس منکر کو کیسے روکیں جس میں حکومت ملوث ہو رہی ہو یا پشت پناہی کر رہی ہو۔اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے افراد اور جماعتیں اتنی قوت کے مالک بنیں جو اس برائی کو روک سکے''۔ (میثاق،مئی ۲۰۱۳،صفحہ،۶۰)

علامہ یوسف القرضاوی مزید لکھتے ہیں:

''عوام طاقت ہیں،عوام کی ملکی سطح کی ایسی فیصلہ کن قوت ہوتی ہے جسے اجتماع سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔جب یہ قوت حرکت میں آ جائے تو کسی میں ہمت نہیں ہوتی کہ اس کا سامنا کرے یا اس کا راستہ روکے۔یہ قوت اپنی تندی اور تیزی میں ٹھاٹھیں مارتے سمندر یا سب کچھ بہالے

جانے والے سیلاب کی طرح ہوتی ہے کہ کوئی شے، حتیٰ کہ مسلح قوتیں بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں۔ یہ مسلح قوتیں بھی تو اسی کا حصہ ہوتی ہیں اور یہ عوام ان قوتوں کے افرادِ خاندان، باپ، بیٹے اور بھائی ہی تو ہوتے ہیں''۔(میثاق، مئی ۲۰۱۳ء، صفحہ ۵۷، ۵۹، ۶۰)

مفتی تقی عثمانی صاحب نے اپنے مضمون ''حکومت کی معزولی'' (شائع شدہ، میثاق دسمبر ۲۰۱۳ء) میں ''شرعی ہڑتال'' کے دلچسپ نام سے، سول نافرمانی پر عمدہ کلام فرمایا ہے۔ حضرت لکھتے ہیں:

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شریعت میں حکومت پر دباؤ ڈالنے کا اور کوئی طریقہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ حقیقت میں شریعت نے ایک راستہ ایسا تجویز کیا ہے کہ اگر قوم اس پر عمل کر لے تو بڑی سے بڑی جابر حکومتوں کے گھٹنے چند گھنٹوں میں ٹکوائے جا سکتے ہیں اور وہ راستہ یہ ہے کہ اس اصول پر عمل کیا جائے کہ:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))(الجامع الصغير للسيوطي، ح:۹۹۰۳، عن عمران بن الحصين)

''خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔''

جب ایک مرتبہ یہ اصول مان لیا جائے کہ کسی مخلوق کے حکم پر خالق کی نافرمانی نہیں کی جا سکتی تو جتنے غیر اسلامی احکام نافذ ہیں، ساری قوم اگر ان میں شرکت سے انکار کر دے تو اندازہ کیجیے کہ حکومت کے پاس کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے؟ فرض کیجیے کہ عدالتوں میں بیٹھنے والے جج اگر یہ کہہ دیں کہ جب تک ہمیں شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کا اختیار نہیں دیا جاتا، اُس وقت تک ہم عدالتوں میں کام نہیں کریں گے اور وکلاء یہ کہہ دیں کہ جب تک قوانین شریعت کے مطابق نہیں ہو جاتے ہم عدالتوں میں بحیثیت وکیل کے پیش نہیں ہوں گے، اگر بینک کے ذمہ دار اور بینک کے ملازمین یہ کہہ دیں کہ جب تک بینکاری کا نظام سود سے پاک نہیں ہو جاتا، ہم بینکوں میں کام نہیں کریں گے، اور اگر عوام یہ کہہ دیں کہ جب تک بینکوں کا نظام سود سے پاک نہیں ہو جاتا، اُس وقت تک ہم بینکوں میں پیسے نہیں رکھوائیں گے، اور تاجر یہ کہہ دیں کہ جب تک بینک سود سے پاک نہیں ہو جاتا، اُس وقت تک ہم اس سے تمویلی معاملات نہیں کریں گے۔ اگر ''لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ'' کی بنیاد پر، جو ان کی شرعی ذمہ داری ہے، سارے عوام مل کر غیر شرعی احکام کی تعمیل سے انکار کر دیں تو آپ ذرا تصور کریں کہ جس دن یہ ہڑتال ہو گی، اُس دن چند گھنٹوں میں حکومت گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گی۔ یہ شرعی ہڑتال ہے''۔

پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف لکھتے ہیں:

''دورِ حاضر میں کسی بھی مسئلے کے بارے میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے اور مخالف قوتوں سے اظہار ناراضگی کرنے کے اور حکومت کے خلاف سیاسی و جمہوری جدوجہد کرنے کے طریقے جلسے، جلوس اور ہڑتال وغیرہ ہی ہیں۔ اس لیے اکثر علماء کے نزدیک ان ذرائع کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بہت سے اسلامی ملکوں میں بھی جن میں پاکستان، ایران، ترکی، انڈونیشیا، ملائشیا، اور بہت سے دوسرے کئی ممالک شامل ہیں لوگ اپنا احتجاج ریکارڈ کرانے کے لیے یہی طریقے اختیار کرتے ہیں''۔

(پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف، ششماہی منہاج، لاہور، جنوری تا جون ۲۰۰۵، صفحہ ۶۲)

چوتھا اعتراض:

محمد رشید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''سوال یہ ہے کہ طریق کار کے چوائس کے ضمن میں جو حق اور آزادی آپ اپنے لیے استعمال کرتے ہیں تو آپ کس اتھارٹی اور دلیل کی بنیاد پر دوسروں سے اپنی رائے سے مختلف طریق کار اختیار کرنے پر ان سے چوائس کا حق چھین لینا چاہتے ہیں؟ کیا ''احتجاجی سیاست'' آسمان سے اترا ہوا کوئی صحیفہ ہے جس کو مضبوطی سے تھام لینے کی صبح شام آپ دعوت دیے چلے جا رہے ہیں؟ اور کیا ''انتخابی سیاست'' قرآن وسنت کی کسی بھی نص سے ''کارِ حرام'' ثابت ہوتا ہے جسے آپ دینی جماعتوں کے لیے شجرِ ممنوعہ ثابت کرنے میں عقل ومنطق کی کوئی دلیل بھی رائیگاں نہیں جانے دیتے؟''۔

جواب:

فاضل مضمون نگار کے لب ولہجے کی تلخی اور کڑواہٹ ہمارے لیے ناقابل فہم ہے، بالخصوص اس تناظر میں کہ وہ ''اصلاح'' کے اس تصور کے علمبردار ہیں جو عاجزی، انکساری اور عبدیت اور انسانی ہمدردی وغم خواری سے عبارت ہے، تاہم ان کے اس لب ولہجے پر کوئی تبصرہ کیے بغیر ہم ان کی خدمت میں یہ گزارش کریں گے کہ ان کا ہم پر یہ اعتراض درست نہیں کہ ہم دوسروں کو طریق کار کی چوائس کا حق نہیں دیتے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ ہم نے کبھی یہ حق چھینا ہی نہیں۔ میثاق کی اِسی تحریر میں جس پر جناب نے تبصرہ فرمایا ہے، امیر تنظیم اسلامی کے یہ الفاظ موجود ہیں ''میں یہ اعتراف کروں گا کہ بدلے ہوئے حالات میں کسی نئے طریقے پر غور کرنا بالکل قابل فہم ہے اور عقل و دانش اسے تسلیم کرتی ہے'' (میثاق، اکتوبر ۲۰۱۳، صفحہ ۳۲)۔ غور فرمائیے ان الفاظ سے دوسروں کو طریق کار کی چوائس کا حق دیا جا رہا ہے یا چھینا جا

رہا ہے؟ ہماری اس بات کی دلیل ہمارا یہ رویہ بھی ہے کہ ہم نے دوسرے طریقے حتیٰ کہ الیکشن تک کو کبھی حرام نہیں کہا۔ نہ اس طریقے کے عاملین کو ضال و مضل قرار دیا ہے اور نہ ہی اُن کے اخلاص پر شبہ کیا ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں ہمارا موقف معروف ہے لیکن ہم پیش کیے دیتے ہیں۔ بانی ُ تنظیم ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

(i) ہمارے نزدیک تاریخ انسانی میں آج تک کوئی انقلاب انتخابات کے ذریعے نہیں آیا۔ (واضح رہے کہ انقلاب سے مراد Politico Socio Economic System میں کوئی بنیادی تبدیلی ہے) یہ بات تاریخی طور پر طے شدہ ہے۔

(ii) ہمارے نزدیک الیکشن پہلے سے قائم کسی نظام کو چلانے کے لیے ہوتے ہیں، کسی نظام کو تبدیل کرنے کے لیے نہیں۔ امریکہ میں دونوں انتخابی حریف یعنی Democrats اور Republicans امریکہ میں قائم نظام پر متفق ہیں۔ ان کے مابین فرق صرف پالیسی سے متعلق بعض معاملات میں ہے۔

(iii) الیکشن خواہ کتنے ہی صاف وشفاف اور غیر جانبدارانہ ومنصفانہ کیوں نہ ہوں، معاشرے میں موجود جو بھی اقتصادی Power bases ہوں گے یا بالفاظ دیگر معاشی واقتصادی ڈھانچے پر جن طبقات کا تسلط ہوگا، ان انتخابات کے نتائج میں انہی کی reflection (عکاسی) ہوگی۔ اگر وہاں جاگیرداری نظام قائم ہے تو کوئی جاگیردار ہی انتخابات کے ذریعے اوپر آئے گا۔ اسی پچاسی فیصد نشستوں پر وہی قابض ہوں گے، باقی پندرہ بیس فیصد محض ڈگڈگی بجاتے رہ جائیں گے۔

مذکورہ بالا تین نکات سے ہم جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ یہ ہے کہ نظام اسلام کے قیام کے لیے الیکشن میں حصہ لینا "Exercise in futility" کے سوا کچھ نہیں ہے، یہ محض قوت اور وقت کا ضیاع ہے۔ تاہم الیکشن کے بارے میں اپنے اس موقف کا بھی میں ہمیشہ اظہار کرتا رہا ہوں کہ یہ حرام نہیں ہیں۔ میں نے مولانا صوفی محمد صاحب سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کئی بار کیا ہے جو مالاکنڈ کی تحریک نفاذِ شریعت کے قائد ہیں۔ ان کا فتویٰ یہ ہے کہ الیکشن میں ووٹ دینا بھی حرام ہے اور الیکشن لڑنا بھی حرام ہے۔ میں ان کے پاس حاضر ہوا تھا۔ دیر کے ایک دور دراز علاقے میں ’’میدان‘‘ نام کا ایک مقام ہے، جہاں صوفی صاحب رہائش پذیر تھے۔ میں ان سے ملنے کے لیے وہاں پہنچا اور عرض کیا کہ مولانا میں اس حد تک آپ سے متفق ہوں کہ الیکشن کا اس لحاظ سے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے سے دین نہیں آسکتا، لیکن آپ اس کو حرام کہہ رہے ہیں تو اس کے لیے کوئی وزنی دلیل درکار ہے۔ اس کے لیے آپ کو علماء کے سامنے اپنے دلائل پیش کر کے ان کا اتفاقِ رائے حاصل کرنا چاہیے۔ میں بہرحال اسے حرام نہیں کہہ سکتا اور میں

نے کبھی بھی اس کو حرام قرار نہیں دیا۔

دوسرے، میں یہ بھی ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ جو لوگ خلوص و اخلاص کے ساتھ قائل ہیں کہ اس ذریعے سے یہاں واقعتاً کوئی تبدیلی آسکتی ہے، اسلامی نظام آسکتا ہے تو وہ ضرور اس کے لیے کام کریں، تاہم ایسے لوگوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ باہم متحد ہو جائیں، تاکہ اسلام کے نام پر الیکشن میں حصہ لینے والے تو ایک پلیٹ فارم پر آجائیں۔ اگر آپ نے اسلام کو ایک پارٹی ایشو بنا ہی لیا ہے تو معاشرے میں اسی بنیاد پر polarization ہو جانی چاہیے۔ سیکولر ذہن کے لوگ ایک طرف ہوں اور مذہبی ذہن کے لوگ ایک طرف اور اگر مذہبی کیمپ پانچ حصوں میں بٹا ہوا ہوگا تو پھر وہی کچھ ہوگا جو اب تک ہو رہا ہے کہ دن بدن عزت کا دھیلا ہو رہا ہے۔ علماء کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ ان کے کچھ بیانات ضرور اخبارات میں چھپ جاتے ہیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ معاشرے پر علماء کی گرفت بتدریج ڈھیلی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور یہ سارا نتیجہ اس غلط حکمت عملی کا ہے جو ان کی طرف سے اختیار کی گئی ہے۔

(مذہبی جماعتوں کے باہمی تعاون کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی مساعی، صفحہ ۵۱ تا ۵۳)

پس ہماری رائے ہے کہ الیکشن نفاذ اسلام کے لیے سود مند نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے اور اس ذریعے سے اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔ البتہ اگر کوئی یہ راستہ اختیار کرتا ہے تو ہم اسے حرام نہیں سمجھتے لیکن اختلاف کا اظہار کریں گے اور اسے اس راستے کی طرف لانے کی کوشش بھی کریں گے جسے ہم دیانتاً صحیح راستہ سمجھتے ہیں۔ ہم فاضل مضمون نگار کو یاد دلانا اور ان کی وساطت سے قارئین البرہان کو یہ بھی بتانا چاہیں گے کہ بانی تنظیمؒ نے سطور بالا میں جس وسعت قلبی کا اظہار کیا اس کا عملی ثبوت یوں فراہم کیا کہ دینی سیاسی جماعتوں نے 2004ء میں ایم ایم اے کی صورت میں جب متحد ہو کر الیکشن لڑنے کا اعلان کیا تو محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے ان کی حمایت میں ایک اخباری اشتہار کی صورت میں لوگوں سے اپیل کی کہ نفاذ شریعت کی خاطر قوم کو چاہیے کہ ایم ایم اے کو ووٹ دے۔

اگرچہ مضمون نگار کی نگاہ میں ہمارا صبح و شام، احتجاجی تحریک کی طرف بلانا مناسب نہیں لیکن ہم اس کے باوجود اس کی طرف بلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہ یہی راستہ ہمارے خیال میں درست ہے۔ پھر اب تو انتخاب میں متحرک لوگوں کے ذہن میں بھی انتخابی راستے کے حوالے سے عدم اطمینان پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ہمارا اشارہ امیر جماعت اسلامی جناب منور حسن صاحب مدظلہ کے ''اشارات'' کی طرف ہے جو جون ۲۰۱۳ء کے انتخابات کے فوراً بعد، ترجمان القرآن میں شائع ہوئے۔ انتخابی دھونس و دھاندلی کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

''تو بجا طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس انتخابی عمل کی کتنی اصلاح ممکن ہے؟ اور سیاسی قیادت

کو بروئے کار لانے کا یہ طریقہ کہاں تک تبدیلی یا انقلاب کے لیے نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے؟''۔

''یہ احساس بجا طور پر پایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی اس کامیابی سے دُور نظر آتی ہے جو ہمارے پیش نظر تھی اور جو نظم جماعت، امیدواران اور کارکنان کی آراء اور تجزیے کے نتیجے میں محسوس ہوتی تھی۔ بہت چھوٹے دائرے میں کامیابی ہوئی۔ کارکن اگرچہ اس لحاظ سے مطمئن ہوتا ہے کہ ہماری جدوجہد دین کے غلبے کی جدوجہد ہے اور ہمارے ذمے اپنے حصے کا کام کرنا ہے لیکن یہ بات پھر بھی درست ہے کہ ہم الیکشن کو تبدیلی کا ایک ذریعہ سمجھتے رہے اور سمجھتے ہیں، اس لیے یہ کارکردگی اور نتائج کئی سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ جن پر سنجیدہ غور وفکر اور ملک کے بدلتے ہوئے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور آبادی کے لحاظ سے منظرنامے کو سامنے رکھ کر مؤثر حکمت عملی اور نقشۂ کار تیار کرنے کی ضرورت ہے''۔

''اس پس منظر میں کچھ اور بھی بنیادی سوالات ذہنوں میں کروٹیں لے رہے ہیں۔ خصوصیت سے ترکی، عرب دنیا، ملائیشیا اور دوسرے مسلم ممالک میں اسلامی قوتوں نے جو تجربات کیے ہیں، ان کو بھی غور سے دیکھنے اور ان کے تجربات کی روشنی میں سیکھنے کی ضرورت ہے لیکن اپنے حالات کے مطابق نئی راہوں کی تلاش نہ صرف یہ کہ شجر ممنوعہ نہیں بلکہ وقت کی ضرورت بنتی جارہی ہے۔ بلاشبہ یہ راہ مسائل اور مشکلات سے عاری نہیں اور اپنی پیچیدگیاں بھی رکھتی ہے اور امکانات بھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انمل بے جوڑ پیوندکاری سے اجتناب کیا جائے اور اپنے حالات کے مطابق ایک سوچے سمجھے عمل کے ذریعے تسلسل کو مجروح کیے بغیر تبدیلی اور نئے تجربات کے امکانات کا جائزہ لیا جائے اور مفید اور قابلِ عمل اقدامات سے گریز نہ کیا جائے''۔

یہاں بانی جماعت اسلامی مولانا مودودیؒ کے الفاظ بھی یاد کرلینے چاہئیں کہ:

''اگر پرامن ذرائع سے جوہر اقتدار ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے''۔

(تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل صفحہ ۱۰۶)

محترم محمد رشید صاحب، خدارا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ اب جب کہ ساٹھ سالہ انتخابی جدوجہد سے جوہرِ اقتدار 'ہاتھ' نہیں آسکا بلکہ حالیہ الیکشن کے نتائج بتارہے ہیں کہ اس میدان میں دینی جماعتوں کا گراف مزید نیچے گرچکا ہے، تو کیا عقل عام، دانشمندی اور اخلاص کا یہ تقاضا نہیں ہوگا کہ آئندہ انتخابی سیاست کے اجتہادی راستے کو چھوڑ کر دیگر جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ جب کہ وہ دیگر جائز شرعی ذریعہ جو تنظیم اسلامی کے پیش نظر ہے، اس کی تصویب وتائید سطور بالا میں علامہ یوسف قرضاوی، مولانا مفتی تقی عثمانی جیسے جید علماء اور اکابر ملت کی تحریروں کے ذریعے ہوچکی

ہے۔ یہی نہیں بلکہ 2010ء میں پاکستان بھر کے اکابر دیوبند کے سہ روزہ اجلاس کا حاصل جس ’متفقہ اعلامیہ‘ کی صورت میں سامنے آیا، اس میں بھی اس کی بھرپور تصویب وتائید موجود ہے۔ پُرامن احتجاجی تحریک بھی چونکہ حرام نہیں بلکہ ایک جائز ذریعہ ہے لہٰذا انتخابات سے کنارہ کش ہوتے ہوئے، انقلابی یا تحریکی طرز پر کام شروع کیا جائے۔ پھر اسی خاص نقطہ نظر سے ان کارکنان کی تربیت کی جائے اور جب جماعت مضبوط ہوجائے تو پھر ایک بھرپور احتجاجی تحریک کے ذریعے باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی جائے۔

فاضل مضمون نگار نے اپنی تحریر میں تنظیم اسلامی کے اساسی نظریات پر مشتمل بعض کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ تنظیم اسلامی کا رویہ ان فکری بنیادوں کے برعکس ہے۔ موصوف کی تنقید اور اپنے کردار کا جائزہ لینے کے بعد ہم دیانتاً یہ سمجھتے ہیں کہ بحمداللہ تنظیم اسلامی نظری اور فکری طور پر انہی نظریات پر گامزن ہے جو ان کتابوں میں پیش کیے گئے ہیں۔ عملی طور پر ہمیں کتنی کامیابی مل سکی، یہ ایک الگ بحث ہے۔ تربیتی پروگراموں میں تنظیم کی ’’قرارداد تاسیس‘‘ کا بار بار مطالعہ اور اس کے تناظر میں تنظیم کے موجودہ رویہ کا خود احتسابی کے انداز میں جائزہ اللہ کے فضل وکرم سے ہمارے معمولات کا مستقل جزو ہے۔ تاھم ہم اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ توسیع دعوت اور تربیت وتزکیہ کے بعض پہلوؤں سے ہم ابھی معیار مطلوب سے پیچھے ہیں۔

حرفِ آخر:

محمد رشید صاحب کی طرف سے پیش کیے گئے اعتراضات کے جوابات میں ہم نے جماعتِ اسلامی اور تنظیمِ اسلامی کے لٹریچر سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ یہ اقتباسات ثابت کرتے ہیں ہے کہ پیش کیے گئے اعتراضات درست نہیں ہیں۔ اِن اعتراضات کا سبب بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ معترض نے دقتِ نظر سے جماعتِ اسلامی اور تنظیمِ اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا۔ مناسب یہی ہوتا ہے کہ کسی شخصیت، جماعت یا تحریک کی فکر اور طریقِ کار پر اعتراض سے قبل اُس کے لٹریچر سے متعلقہ مواد کے ہر پہلو کا مطالعہ کر لیا جائے۔ موصوف کے پیش کردہ اہم اعتراضات کا جواب بحمدللہ ہم نے دے دیا ہے۔ البتہ ہماری رائے میں موصوف نے چند اور ضمنی اعتراضات بھی کیے ہیں۔ اگر موصوف ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی تصانیف ’’برصغیر پاک وہند میں اسلام کے انقلابی فکر کے تعمیل وتجدید اور اس سے انحراف کی راہیں‘ اور ’’تحریکِ جماعتِ اسلامی......ایک تحقیقی مطالعہ‘‘ کا بغور مطالعہ فرمالیں تو اُنہیں اپنے اِن اعتراضات کا جواب بھی مل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں خلوص کے ساتھ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مثبت انداز سے اپنی توانائیاں لگانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

انا للہ و انا الیہ راجعون

عالم اسلام کے عظیم مفکر، ادیب اور دانشور سید قطب شہیدؒ کے بھائی پروفیسر محمد قطب ۴/اپریل ۲۰۱۴ء کو سعودی عرب میں جلاوطنی کی حالت میں مکہ مکرمہ میں وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر ۹۵ سال تھی اور وہ کافی عرصہ سے علیل تھے۔

ان کی تصانیف میں سے 'بیسویں صدی کی جہالت'، 'اسلام۔غلط سمجھا گیا دین'، 'اسلام کے بارے میں شبہات'، 'اسلامی بیداری' اور 'مستقبل اسلام کا ہے' زیادہ معروف ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے اور ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے۔

فقہ و قانون　　ڈاکٹر محمد امین

مسلم ممالک کے باشندوں کے لیے بلاد کفار کی شہریت غیر شرعی ہے (آخری قسط)

غیر مسلم ممالک کی شہریت اور اس کے لیے حلف اٹھانا

ایک مسلمان کا کسی غیر مسلم ریاست کی شہریت اختیار کرنا صرف غیر مسلموں کے ساتھ مستقل رہائش اختیار کرنا ہی نہیں ہے جس سے شریعت کئی ممکنہ مفاسد کی وجہ سے منع کرتی ہے، جیسا کہ سطور بالا میں گزر چکا، بلکہ یہ اس سے کہیں بڑھ کر ایک بڑا اور سنجیدہ معاملہ ہے کیونکہ تہذیب اور، معاشرے کی طرح ہر ریاست بھی کسی نہ کسی نظریے پر کھڑی ہوتی ہے اور جیسا کہ معروف و معلوم ہے کہ اس زمین پر جب سے انسان موجود ہے، زندگی گزارنے کے لیے اس کے سامنے دو ہی بنیادی نظریے رہے ہیں: ایک اللہ کی بڑائی کو تسلیم کر کے اور اس کی عبودیت اختیار کر کے زندگی گزارنے کا نظریہ (یعنی توحید و رسالت اور آخرت) جسے اسلام کہا جاتا ہے اور دوسرے غیر اسلام یعنی اللہ کی بڑائی کو تسلیم کرنے کی بجائے یا دوسرے لفظوں میں اس کی بڑائی کا انکار (یعنی کفر کرتے ہوئے) انسان کا خود کو بڑا، آزاد اور خود مختار سمجھنا اور زندگی اپنی عقل، اپنے تجربہ و مشاہدہ اور اپنی خواہشات (ہوائے نفس) کے مطابق گزارنا۔ چنانچہ مغربی تہذیب (جو آج دنیا پر غالب ہے) اس دوسرے گروپ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی نظریاتی

بنیاد یہ ہے کہ انسان آزاد وخود مختار ہے اور اپنی زندگی گزارنے کے بارے میں سارے فیصلے خود کر سکتا ہے اور وہ کسی خدا کا عبد نہیں ہے کہ اس کی مرضی پر چلے (ہیومنزم)۔اور اگر کسی نے خدا اور مذہب کو ماننا ہے تو اپنی ذاتی زندگی میں مان لے لیکن انسان کی اجتماعی اور ریاستی زندگی میں خدا اور مذہب کو دخل دینے کا بہر حال کوئی حق نہیں ہے (سیکولرزم)۔اور یہ کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور زیادہ سے زیادہ مال کمانا اور زیادہ سے زیادہ دنیاوی سہولتیں اور آسائشیں حاصل کرنا ہی انسانی کوششوں کا مرکز ومحور ہونا چاہیے (نظام سرمایہ داری یا کیپٹل ازم)۔اور علم اور حقائق کا منبع انسانی عقل اور اس کا تجربہ ومشاہدہ (یعنی حسی علم) ہے نہ کہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ کوئی پیغامِ ہدایت۔اور انسان چونکہ آزاد اور خود مختار ہے لہذا عوام اپنے جن نمائندوں کو حکومت چلانے کے لیے منتخب کرتے ہیں وہ بھی آزاد اور مختار ہوتے ہیں اور جس چیز کو چاہے حلال اور جس کو چاہیں حرام قرار دے سکتے ہیں (یعنی جمہوریت اور پارلیمنٹ کی بالا دستی کا تصور) چنانچہ مغربی ممالک کے پارلیمان زنا،شراب،جوئے،فحاشی وغیرہ کو حلال قرار دے چکے ہیں۔

یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن پر مغربی تہذیب،معاشرے اور ریاست کی بنیادیں کھڑی ہیں اور جن کا اظہار وہاں کے دساتیر میں ہوتا ہے جن کے مطابق کہ ریاست کا نظم ونسق چلایا جاتا ہے۔یہ امریکی اور یورپی ریاستیں اگر یہودیت اور عیسائیت پر مبنی ہوتیں تو بھی یہ بلاد کفار ہی تھیں لیکن یہ جن نظریات پر کھڑی ہیں وہ تو خالص شرک اور کفر ہے لہذا یہ ممالک بلاشبہ بلاد کفار ہیں بلکہ مسلمان ممالک کے خلاف مسلسل جارحانہ حملوں کی وجہ سے یہ بلاد الحرب ہیں۔

اب آیئے ان مغربی ممالک / بلاد کفار کی شہریت لینے کے لیے اٹھائے جانے والے حلف کی طرف۔طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی ریاست کا شہری بننا چاہتا ہے تو وہ یہ عہد کرتا اور حلف لیتا ہے کہ وہ ریاست کے آئین وقوانین اور اصول واقدار کی پیروی کرے گا اور اس ملک کی حفاظت وخود مختاری کے لیے جان لڑا دے گا۔چنانچہ امریکی شہریت اختیار کرتے ہوئے جو حلف لینا پڑتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

" I hereby declare, on oath, that I absolutely and entirely renounce and abjure all allegiance and fidelity to any foreign prince, potentate, state, or sovereignty of whom or wich I have heretofore been a subject or citizen: that I will support and defend the Constitution and Laws of United States of America against all enemies, foreign and domestic; that I will

bear true faith and allegiance to the same; that I will bear arms on behalf of the United States when required by the law; that I will perform noncombatant sevice in the Armed Forces of the Unites States when required by the law; that I will perform work of national importance under civilian direction when required by the law; and that I take this obligation freely without any mental resevation of purpose of evasion; so God help me "

ترجمہ: ''میں حلفیہ اعلان کرتا ہوں کہ اس سے پہلے مَیں جس ریاست کا شہری تھا اور جس حاکمیت اعلیٰ اور حکمرانوں کا پیروکار تھا، میں ان سے مکمل دستبرداری اور برأت کا اعلان کرتا ہوں؛ اور یہ کہ مَیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آئین اور قوانین پر مکمل ایمان رکھتے ہوئے ان کا پوری طرح وفادار رہوں گا اور اندورنی و بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں ان کی مکمل حمایت اور ان کا دفاع کروں گا اور جب قانون کا مطالبہ ہوگا تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دفاع کے لیے ہتھیار اٹھاؤں گا اور اس کی افواج میں سویلین خدمات انجام دوں گا؛ اور یہ کہ قانون کے مطابق قومی اہمیت کی خدمات انجام دوں گا؛ اور یہ کہ میں اپنی آزاد مرضی سے، بغیر کسی ذہنی تحفظ کے اور عمل درآمد سے بچنے کی نیت کے، اس ذمہ داری کو اٹھانے کا عہد کرتا ہوں سو اللہ اس میں میری نصرت فرمائے''۔

اور کینیڈا کی شہریت اختیار کرتے ہوئے جو حلف لینا پڑتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"From this day forword, I pledge my loyalty and allegiance to Canada and Her Majesty Elizabeth the Second, Queen of Canada. I promise to respect our country's rights and freedoms, to uphold our democratic values, to faithfully observe our laws and fulfill my duties and obligation as a Canadian citizen''

ترجمہ: ''آج کے بعد میری ہر طرح کی وفاداری کا مرکز و محور کینیڈا اور اس کی عزت مآب ملکہ الزبتھ ثانی ہوں گی۔ میں عہد کرتا ہوں کہ میں اپنے ملک کے حقوق اور آزادیوں کا احترام کروں گا، اس کی

جمہوری اقدار کا تحفظ کروں گا؛ ملکی قوانین کی صدق دلانہ اطاعت کروں گا اور کینیڈا کے شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ادا کروں گا۔''

حلف کی ان عبارتوں کو زبان سے دہرانا اور ان کو قبول کرتے ہوئے تحریراً و توثیقاً دستخط کرنا بظاہر اسلام پر ایمان کی نفی ہے کیونکہ ایسا کرنے والا علی الاعلان اور عمداً اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کی حاکمیت اور مسلم ریاست (دارالسلام) کی ولایت سے دست بردار ہوتا ہے اور وہ بلاد کفار کے غیر اسلامی قوانین اور اصول و اقدار پر عمل کا اور دارالکفر کے لیے جان لڑانے کا عہد کرتا ہے۔ واضح رہے کہ امریکہ، برطانیہ جیسے ممالک جن کی بنیاد مغربی فکر و تہذیب پر ہے بلا شک و شبہ وہ دارالکفر ہیں بلکہ مسلمانوں سے معاندانہ رویہ رکھنے کی بنیاد پر دارالحرب ہیں۔ چنانچہ مولانا ادریس کاندھلویؒ کہتے ہیں کہ (۱) اسلامی احکام پر عمل کی آزادی نہ ہونے کی وجہ سے امریکہ و برطانیہ دارالحرب ہیں۔ (۲) کیونکہ وہ نہ صرف کفر پر عامل ہیں بلکہ کفر کے علم بردار ہیں۔ وہاں اسلامی احکام پر عمل کی آزادی نہیں ہے بلکہ ان پر اتنا ہی عمل کیا جا سکتا ہے جس کی وہاں کی حکومت اور قانون اجازت دیں اور وہ کفر کو دنیا پر غالب کرنا چاہتے ہیں اور کئی مسلم ممالک کے خلاف حالت جنگ میں ہیں لہذا اس طرح کا حلف اٹھانا اپنے دین کی نفی کرنا ہے۔

کفار کے قوانین کی اطاعت تو دور کی بات ہے قرآن حکیم تو ان مسلمانوں کے دین کی بھی نفی کرتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلوں پر دل سے راضی نہ ہوں:

''فلا و ربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما۔''(النساء ۶۵:۴)

''پس اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رب کی قسم! ایسے لوگ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام باہمی جھگڑوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو فیصلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں اس پر وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ دل و جان سے اسے تسلیم کریں۔''

چنانچہ سعودی دارالافتاء کے سابق سربراہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبدالعزیزؒ کہتے ہیں کہ بلاد کفار کی شہریت قبول کرنے اور ان کے قوانین کی اطاعت اور ان پر عمل ایک نوع کا شرک ہے (۳) شیخ کے الفاظ یہ ہیں ''یخشی علیہ ان یقع فی الشرک، لانھم اذا اعطوہ الجنسیۃ قد یلزمونہ لقوانین و شرائط'' یعنی ڈر ہے کہ وہ شرک میں مبتلا ہو جائے گا کیونکہ جب وہ اسے اپنی شہریت دیں گے تو اسے اپنے قوانین اور شرائط کا پابند کر لیں گے''۔

علامہ رشید رضا مصری نے اسے ارتداد، ملت سے خروج اور قابل قتل جرم قرار دیا ہے۔ ان سے جو

سوال کیا گیا اور انہوں نے اس کا جو جواب دیا وہ ملاحظہ ہو:

وقد سئل الشیخ محمد رشید رضا عن تجنس المسلم بجنسیة تنافی الاسلام۔ کما هو حاصل فی بلاد تونس آنذاک۔ و ما یتضمنه هذا التجنس من انکار لما هو معلوم من الدین بالضرورة، و الوقوف مع الکفار عسکریاً لقتال المسلمین۔۔۔ اخ۔

فکان من جوابه۔:

”اذ کانت الحال کما ذکر فی هذا السؤال، فلا خلاف بین المسلمین فِی أن قبول الجنسیة ردة صریحة، و خروج من الملة الاسلامیة، حتی أن الاستفناء فیها یعد غریباً فی مثل البلاد التونسیة التی یظن أن عوامها لا یجهلون حکم ما فی السؤال۔۔۔۔

من الأمور المعلومة من الدین بالضرورة۔۔۔

الی أن قال، ان قبول المسلم لجنسیة ذات أحکام مخالفة لشریعة الاسلام خروج من الاسلام فانه رد له، و تفضیل لشریعة الجنسیة الجدیدة علی شریعته، ویکفی فی هذا أن یکون عالماً بکون تلک الأحکام التی

آثر غیرها علیها هی أحکام الاسلام فلا یعامل معاملة المسلمین، و اذا وقع من أهل بلد أو قبیلة وجب قتالهم علیه حتی یرجعوا۔ (۴)

ترجمہ: ”شیخ رشید رضا سے ایسی شہریت لینے کے بارے میں پوچھا گیا جس میں اسلام کی مخالفت ہو بایں معنی کہ اس میں ضروریات دین کا انکار ہو اور مسلمانون کے خلاف قتال میں کفار کا ساتھ دینا پڑے۔ جیسا کہ ان دنوں تیونس میں ہو رہا تھا،“ تو انہوں نے جواب دیا کہ ”اگر حالات ویسے ہوں جیسا کہ سوال میں ذکر کیے گئے ہیں تو مسلمانوں میں اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس طرح شہریت لینا صریح ارتداد اور ملت اسلامیہ سے خروج کے مترادف ہے بلکہ تیونس جیسے اسلامی ملک سے اس طرح کے سوال کا آنا ہی تعجب خیز ہے کہ وہاں کے مسلمانوں سے مستبعد ہے کہ وہ ایسے واضح حکم کو نہ جانتے ہوں گے۔“

’الدین بالضرورۃ‘ کے حوالے سے شیخ نے کہا: ”ایسے ملک کی شہریت قبول کرنا جس کے قوانین خلاف شریعت ہوں، ارتداد اور اسلام سے خروج کے مترادف ہے کیونکہ یہ وضعی قوانین کو شریعت پر فوقیت دینا ہے۔ اور اگر ایسے شخص کو معلوم ہو کہ جن قوانین کو وہ قبول کر رہا ہے وہ خلاف اسلام ہیں تو اس کے ساتھ

مسلمانوں جیسا معاملہ نہیں کیا جائے گا اور اگر ایسا کرنے والو کوئی گروہ یا قبیلہ ہو تو ان کے خلاف قتال جائز ہے جب تک کہ وہ اس سے رجوع نہ کریں۔''

مصر کی افتاء کمیٹی نے شیخ علی محفوظ کی صدارت میں یہی فتوی دیا تاہم ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ دیکھا جانا چاہیے کہ ایسی شہریت قبول کرنے والا 'مضطر' نہ ہو کہ اسے مسلم ملک کے ظالم و جابر حاکم سے جان و مال و آبرو کا حقیقی خطرہ درپیش ہو، وہ بلاد کفر میں رہائش کو پسند نہ کرتا ہو اور وہاں حسب استطاعت اسلامی زندگی گزارنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ اسی طرح متعلقہ ملک کے حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہ دارالحرب ہے یا معاہد ملک، اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کا رویہ کیسا ہے؟ اور اس مسلم ملک کے حالات کیسے ہیں جہاں سے بھاگ کر کوئی مسلمان کسی کافر ملک میں پناہ لینا اور وہاں کی شہریت لینا چاہتا ہے۔''

سابق امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل مرحوم نے مجمع الفقہی الاسلامی جدہ کے توجہ دلانے پر اس موضوع پر ایک مبسوط رسالہ لکھا تھا جس کے آخر میں اس کی تلخیص کرتے ہوئے لکھا کہ بلاد کفار کی شہریت کا حلف اٹھانے والوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اولاً: وہ لوگ جو بلاد کفار کو پسند کرتے ہوں، وہاں کی شہریت اور رہائش کو مسلم ممالک پر ترجیح دیتے ہوں اور غیر اسلامی قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں تو ان کے کفر اور ارتداد میں کوئی شک نہیں اگرچہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہیں، کلمہ پڑھیں، نماز ادا کریں اور بعض اسلامی احکام پر عمل کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''ومن یتولھم منکم فانہ منھم''(المائدہ ۵:۵۱)

''تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔''

اور **''افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزآء من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیٰوۃ الدنیا ویوم القیمۃ یردون الیٰ اشد العذاب وما اللہ بغافل عما تعلمون''(البقرہ ۲:۸۵)**

''حالانکہ ان کو ان کے گھروں سے نکالنا ہی تمہارے لیے حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصے کو مانتے اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہوں اور مرنے کے بعد قیامت کے دن انہیں سخت عذاب میں ڈالا جائے۔''

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''من احب قوماً حشر معھم''(۵)

''جو جس قوم سے محبت کرے گا قیامت کو اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔''
اور یہ بھی فرمایا کہ:

''المرء مع من احب''(۶)

''آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرے۔''

بلاد کفر کی شہریت کے لیے حلف اٹھانے والا دوسرا گروہ وہ ہے جس کے پیش نظر محض دنیوی مفاد ہو جیسے تجارت یا اچھی ملازمت اور دیگر سہولتیں۔ ایسے اشخاص اگر اسلامی احکام پر عمل کو پسند کرتے ہوں، اپنے دین کا فخریہ اظہار کریں، حتی الوسع غیر مسلم عدالتوں سے رجوع نہ کریں اور اگر ان عدالتوں کا فیصلہ خلاف اسلام ہو تو اسے قبول نہ کریں تو ایسے لوگوں کا ایمان اگرچہ خطرے میں ہے اور وہ ایک عظیم منکر کا ارتکاب کر رہے ہیں لیکن مَیں ان پر کفر وارتداد کا حکم لگانے میں توقف کروں گا گو اہل کفر سے ان کی محبت اور ان کے ساتھ معاشرت پر راضی ہونا انہیں اللہ تعالیٰ کی اس وعید کا مستحق بنا دیتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

''قل ان کان آباؤ کم و ابنآئکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مسکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لایھدی القوم الفٰسقین''(التوبہ ۹: ۲۴)

''اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں سے کہہ دیں کہ اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا، تمہارا وہ کاروبار جس کے بند ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے اور تمہارے رہنے کے گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو، یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

اور فرمان الٰہی ہے کہ:

''لاتجدو قوما یومنون باللہ والیوم الاٰخر یوادون من حآد اللہ و رسولہ ولو کانوا اٰباءھم او ابنآءھم او اخوانھم او عشیرتھم'(المجادلہ: ۲۲)۔

''تم ان لوگوں کو جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں کبھی اللہ اور اس

کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالفوں سے دوستی کی پینگیں بڑھاتے نہ دیکھو گے اگر چہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے خاندان والے ہی کیوں نہ ہوں''۔

تیسرے درجے میں وہ اشخاص ہیں جنہیں مجبوراً بلاد کفر میں رہنا پڑا ہو، اس حالت میں کہ وہ ان سے نفرت کرتے ہوں اور اس کا اظہار کرتے ہوں۔ اپنے دین کو سچا اور ان کے دین کو باطل قرار دیتے ہوں۔ ایسے لوگ بلاشبہ بلاد کفر کی شہریت لینے اور وہاں رہنے کی بناء پر گنہگار ہیں اور ان کا اور ان کی اولاد کا ایمان خطرے میں ہے، لیکن انہیں بہر حال کافر و مرتد نہیں کہا جائے گا۔

تاہم جو لوگ نہ شہریت لیں اور نہ اس کے لیے کوشش کریں، اپنے دین کی حقانیت کا اعلان و اظہار کریں، اس پر عمل کریں اور کفار کے دین کو باطل کہیں اور انہیں قبول اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ یہ کر سکیں تو وہاں رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر وہ یہ نہ کر سکیں تو ان پر وہاں سے ہجرت فرض ہے اور ان کے وہاں رہنے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔

ہم امام ابن السبیل کے فتوی کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بلاشبہ کفار کے ساتھ معاشرت مردود ہے اور ایسی شہریت قبول کرنا بھی جس میں کفار کے ایسے قوانین کی متابعت کرنا پڑے جو صریحاً خلاف شریعت ہوں البتہ اس اصول کو قبول کرنے کے بعد کسی انفرادی اضطرار اور استثناء کے بارے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ اس طرح کا استثناء کسی عذر لنگ کی بنیاد پر نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ بہت سے مسلمان خصوصاً پاکستانی سیاسی مظلوم بن کر یا قادیانی یا شیعہ بن کر یا طالب علموں کا روپ دھار کر یا وہاں شادی کا ڈھونگ رچا کر مغربی ممالک کی شہریت لیتے ہیں اور اصل مقصد صرف وہاں زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا، سہولتوں سے فائدہ اٹھانا اور دنیا بنانا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان مقاصد کے لیے دین و شریعت کے واضح اصولوں کی مخالفت کی اجازت کوئی عالم دین بھی نہیں دے سکتا۔

لہذا ہماری رائے میں:

۱۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بلاد کفار کی شہریت قبول کرے اور غیر اللہ کی حاکمیت، غیر اسلامی آئین و قوانین کے اتباع اور بلاد کفار کی حفاظت کے لیے جان لڑانے کا حلف اٹھائے یا صرف دولت دنیا کی خاطر دارالاسلام کی شہریت عمداً ترک کر دے؛ اور

۲۔ کسی مسلمان ملک کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو اپنی شہریت کے ساتھ بلاد کفار کی شہریت قبول کرنے کی بھی اجازت دے۔

لہذا حکومت پاکستان کو چاہیے کہ اس نے جن بلاد کفار کے ساتھ دوہری شہریت کے معاہدے کر رکھے ہیں انہیں منسوخ کرے اور دوہری شہریت کے حامل افراد کو ایک متعینہ تاریخ کے اندر بلاد کفار کی شہریت ترک کرنے کا حکم دے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے نہ انہیں بلاد و کفار کی شہریت لینی چاہیے اور نہ ان کی شہریت کا حلف اٹھانا چاہیے۔ البتہ شریعت جن شرائط کے ساتھ بلاد کفار میں رہنے کی اجازت دیتی ہے، ان کے مطابق وہ وہاں رہ سکتے ہیں۔ مشہور اسلامی دانشور اور مصنف ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کی مثال ہمارے سامنے ہے جو ساری عمر فرانس میں رہے لیکن انہوں نے وہاں کی شہریت نہیں لی۔

آخری بات یہ کہ ہم اس رائے میں منفرد نہیں ہیں۔ عالم اسلام کے متعدد علماء اس سے پہلے یہی رائے دے چکے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اوپر گزر چکا نیز سعودی عرب کے مرکزی دارالافتاء نے شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کی سربراہی میں بلاد کفار کی شہریت اور حلف کے خلاف فتوی دیا ہے (۷)۔ تیونس کے الشیخ محمد الشاذی النفیر نے جو رابطہ عالم اسلامی کے مجمع الفقہی الاسلامی جدہ کے رکن بھی ہیں اور (۸) مفتی دیار یمن شیخ مقبل بن ھادی الوداعی (۹) اور کراچی کی جامعہ حنفیہ کے شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر فقیر حسین حجازی (۱۰) بھی بلاد کفار کی دوہری شہریت کے خلاف فتوی دے چکے ہیں۔

حواشی

۱۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، عقائد اسلام، ص ۲۳۸
۲۔ اگرچہ مسلم ممالک اپنی کمزوری کی وجہ سے انہیں دارالحرب قرار نہیں دیتے۔
۳۔ شرح بلوغ المرام، کتاب الجہاد، شریط ا
۴۔ مسند احمد بن حنبل، ج ٦، ص ۱۴۵، ۱٦۰
۵۔ صحیح بخاری، ادب ۹٦
٦۔ فتاوی العلما الاکابر فی حکم التجنس بجنسیۃ الکفار الاصاغر، ص ۳٦۰
۷۔ فتوی رقم ۲۳۹۳ برئاسۃ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز
۸۔ الشیخ محمد بن عبداللہ بن السبیل، التجنس بجنسیۃ دولۃ غیر اسلامیۃ بواسطہ انٹرنیٹ

۹۔ http:\\www.ajurry.com/vb/showthread.php?t=9009

۱۰۔ ماہنامہ چراغ اسلام گوجرانوالہ، جنوری ۲۰۱۳ء، ص ۳۲۔ ۴۷

اسلام اور مغرب

محمد ظفر اقبال☆

مادی ترقی کا لازمی نتیجہ ۔شناخت کا بحران

واہمہ یا حقیقت؟

یہ زمانہ انسانی فکر اور معاشرے کی ہر سطح پر مغربی افکار اور تہذیب کے غلبے کا زمانہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب اپنی ابتدا سے اب تک خالص مادیت کی علم بردار رہی ہے۔ مادی ترقی [material progress] ہی کے باعث مغرب آج پوری دنیا پر عملاً متصرف ہے۔ ماریہ سبرٹ لکھتی ہیں:

It was progress which had permitted Europeans to 'Discover' the whole world, and progress which would explain their growing hegemony over the global horizon.[۱]

اس حقیقت کے بالمقابل یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مسلمان مادی ترقی میں بہت پیچھے ہیں۔ مغرب کی مادی ترقی اور فتوحات کا عروج، امت مسلمہ پر مغرب کے تسلط اور یلغار کی مسلسل اور متواتر سرگرمیاں اور مسلمانوں کی استخلاف فی الارض سے محرومی نے مسلم دنیا کو عجیب وغریب صورت حال سے دوچار کر رکھا ہے۔ مسلمان اس وقت بیک وقت چار ادوار میں ایک ساتھ زندہ ہیں:

[۱] مسلمانوں کا دینی و مذہبی پس منظر تقریباً ۱۵۰۰ سال قدیم ہے۔

[۲] مسلمانوں کا معاشرتی ڈھانچہ کم وبیش سترھویں اٹھارویں صدی کا ہے۔

[۳] مسلمان عملاً بیسویں صدی میں جی رہے ہیں۔
[۴] مسلمانوں کی معلومات اکیسویں صدی کی ہیں۔

اس صورت حال نے مسلم دنیا کو عجیب مخمصے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہ حیثیت قوم مسلمان ایک شکست خوردہ دنیا کے باسی ہیں جو اپنی سمت اور مقام کے تعین میں سرگرداں ہو۔ گزشتہ ڈیڑھ صدیوں میں امت مسلمہ کے علمی نمائندوں نے زوال امت کے تعین کی جستجو میں جو تحریری سرمایہ جمع کیا ہے، اسے پڑھ کر بہ طور امت مسلم شناخت کا سوال پوری شدت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ کیا واقعی مسلمان اپنی شناخت کا غالب حصہ کھو چکے ہیں؟ اور باقی ماندہ مسلسل کھو رہے ہیں؟ زوال امت کے اسباب اور تجزیوں کا غالب حصہ آپس میں متضاد اور متصادم معلوم ہوتا ہے۔ اور اس پوری بحث کے تفصیلی مطالعے کے بعد سوائے الجھاؤ کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

☆ zafar.q.iqbal@gmail.com

زوال سے دوبارہ کمال کی بازیافت کے لیے حکمت عملی اور لائحہ عمل کے حوالے سے مسلم اہل فکر و قلم بالعموم تین نقاط نظر کے حامی معلوم ہوتے ہیں:

مادّی ترقی اصل الاصول اور مذہب چند کلیات کا نام ہے: مفکرین کا پہلا طبقہ

پہلا طبقہ قلیل افراد کے ایسے گروہ پر مشتمل ہے جس کے نزدیک مادی ترقی [material progress] کا حصول اصل الاصول ہے۔ غالب تعقل [dominant discourse] کے ساتھ چلنا ہی حقیقی دانش مندی ہے۔ مذہب اگر انسانوں کے لیے آیا ہے تو اس کے قابل قبول ہونے کی شرط لازم یہ ہے کہ وہ زمانے کے کسوٹی پر کسے جانے کے بعد اس سے کھرا نکل آئے۔ بہ صورت دیگر مذہب اکیسویں صدی میں رہنے والے معراج ارتقا پر فائز عقلیت اور تجربیت پسند انسانوں کے لیے اپنے اندر کشش کا کوئی سامان نہیں رکھتا۔ دنیا میں کامل انہماک، تمتع فی الارض اور تسخیر کائنات ہی فی الحقیقت دانش مندی اور فطرت کا تقاضا ہے۔ مذہب چند اصولی ہدایات اور کلیات کا نام ہے۔ اس کا تعلق انسان کی ذاتی اور انفرادی زندگی سے ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی اور معاشرتی معاملات کے ہر ہر پہلو میں مذہب کی ''دراندازی'' ہرگز قابل قبول نہیں۔ عہد جدید میں معاشرے مذہب کی بنیاد پر تعمیر و تشکیل نہیں پاتے بلکہ ترقی، ارتقا، معیار زندگی، سہولت، آسائش، طاقت، اقتدار اور سرمائے کی بنیاد پر قائم کیے جاتے ہیں۔ اور ان ہی اصولوں پر جانچے اور پرکھے جاتے ہیں۔ اگر اس مسلّمہ حقیقت کے باوجود بھی انسانی معاشرے کا کوئی طبقہ مذہب سے اپنا تعلق استوار اور قائم رکھنے پر مصر ہو تو اسے چاہیے کہ جرمن اور فرنچ قومیتوں کی طرح مسلم قومیت کی وحدت کو اپنے ساتھ ملحق رکھ کر مادی ترقی کے کسی بھی سیاسی، سماجی، عمرانی، معاشی یا قانونی ماڈل کو اختیار کر لے۔

اگر مادی ترقی کی راہ میں اسلامی علمیات [Islamic Epistemology]اور مابعد الطبیعیات[Metaphysics] میں تبدیلی، ترمیم یا تنسیخ کرنی پڑے تو اسے بے خوف وخطر قبول کر لینا چاہیے۔عزت اور ذلت کا فیصلہ کن اور حتمی معیار''مادی ترقی'' ہے۔

یہ طبقہ مغربی افکار وتہذیب اور فکر وفلسفے کو ایک عالم گیر سچائی اور فطری حقیقت کے طور پر قبول کرتا ہے۔ مذہب اور دینی اخلاقیات اس طبقے کی نظر میں از کار رفتہ باتیں ہیں، اور ذہن انسانی کی عدم بلوغت[immaturity] کی یادگار ہیں۔

اس طبقے سے وابستہ مفکرین بالعموم ادب، فلسفہ، عمرانیات اور معاشیات کے شعبوں سے وابستہ ہوتے ہیں، اس طبقے کے وہ افراد جو برعظیم سے وابستہ ہیں، ان کی اکثریت اسلامی علوم اور دینی مصادر علمی تک بہ راہ راست رسائی نہیں رکھتے۔ اسلامی فکر سے متعلق ان کے خیالات کا بنیادی حوالہ مستشرقین ہی کی کتابیں ہیں۔اس وقت اسلامی دنیا میں مغرب کے زیر اثر''بنیاد پرستی'' کے خلاف جنگ میں اس طبقے سے وابستہ افراد کی خدمات وسیع پیمانے پر حاصل کی جارہی ہیں۔عصری تعلیمی اداروں میں ''روشن خیالی'' کی ترویج کے لیے ایسے افراد کی افزائش مسلسل کی جارہی ہے تاکہ اسلامی دنیا میں لادینیت [Secularism] کو فروغ حاصل ہو سکے۔

اسلام کے دفاع اور ترویج کے لیے ترقی ایک ناگزیر ضرورت: مسلم مفکرین کا دوسرا طبقہ

دوسرا طبقہ مخلص مسلم مفکرین کے ایسے گروہ پر مشتمل ہے جن کے نزدیک اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی غیر مشروط اور اٹوٹ ہے۔مسلمانوں کی کامیابی اور ناکامی کا واحد پیمانہ اسلام ہے۔ اسلام کو ماننے اور اس پر عمل کا تقاضا اسلام کی ترویج، اشاعت اور اس کے عملی نفاذ سے عبارت ہے۔امت مسلمہ کے دینی اور معاشرتی تشخص کو قائم رکھنے، اسلام کو ریاستی سطح پر نافذ کرنے اور عسکری سطح پر مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے مادی ترقی[material progress] کا حصول ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام اصل ہے اور ترقی اس اصل کو مضبوط، محفوظ اور مستحکم کر دینے کی''شاہِ کلید'' ہے۔

مغربی فکر وتہذیب کے بے شمار پہلو مثلاً سیکولرازم، قوم پرستی، اباحیت پرستی، اخلاقی بے اعتدالی، جنسی بے راہ روی وغیرہ صریحاً مسترد کر دینے کے قابل ہیں۔اس کڑی تنقید کے باوجود مادی ترقی کا''قفل ابجد'' بہ ہر حال مغرب ہی کے پاس ہے۔انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مغرب کے بے شمار پہلو لائق رد سہی، لیکن اس کے بہت سے اجزا سے استفادہ خود اسلام کے دفاع وترویج اور ملت اسلامیہ کے تہذیبی تشخص کی ناگزیر مجبوری ہے۔مغربی تجربات اور اکتشافات خصوصاً سائنسی علوم وفنون اور سائنسی منہاج کا اخذ وکسب بہت ضروری ہے۔اس سلسلے میں تعلیم وتحصیل ہی وہ راہ ہے جس پر چل کر مطلوب و مقصود میں کامیابی کا امکان ہے۔مغرب سے علوم وفنون سے اکتساب اور استفادے کے وقت نہایت حزم اور احتیاط اور چھان پھٹک کی ضرورت ہے۔اس سلسلے میں خذ ما صفا و دع ما کدر کا اصول پیش

نظر رہنا چاہیے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اسلامی مابعدالطبیعیات، علمیات اور اخلاقیات کے حصار میں ان علوم وفنون کی تحصیل کریں۔ اس طرح ان مغربی علوم وفنون کی تحصیل کے نتائج اور اثرات ہرگز وہ نہ ہوں گے جن کا اظہار مغرب سے ہوا ہے۔ ایک بار جب ان علوم فنون کی تکمیل وتحصیل ہوجائے گی تو اس وقت مسلم سائنس دانوں کو چاہیے کہ وہ مغرب کے فلسفیانہ نظریات سے دامن جھاڑ کر اسلامی مابعدالطبیعیات، علمیات اور اقدار کے زیر اثر ایسے نتائج پیدا کریں جو مغرب سے الگ ہوں۔

مادی ترقی اور سائنسی علوم وفنون اصلاً غیر اقداری [value neutral] ہیں۔ بالفاظ دیگر سائنسی علوم اور اس کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی ترقی فی نفسہٖ کوئی اچھائی یا برائی نہیں رکھتی، بلکہ اس کے استعمال کا مقصد اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔

مخلص مفکرین کا یہ گروہ اسلامی علمیات پر تو گہری نظر رکھتا ہے، لیکن مغربی فکر و فلسفے پر، الا ماشاءاللہ، تجزیاتی اور تنقیدی نظر نہیں رکھتا۔

دین اور مادی ترقی دو الگ مابعدالطبیعی دائروں کے رہین: مفکرین کا تیسرا طبقہ

تیسرا طبقہ مخلص مسلم مفکرین کے ایسے گروہ پر مشتمل ہے جو اسلامی علوم اور مغربی فکر وتہذیب کی اصلیت اور حقیقت کو اس کے بنیادی ماخذ اور سیاق وسباق کے ساتھ نہ صرف جانتا ہے، بلکہ اسلامی علوم کی روشنی میں اس کے محاکمے کی بھی اہلیت رکھتا ہے۔ ان کے مطابق مغربی طرز کی مادی ترقی کے حصول کے لیے صرف مغربی زبان اور سائنسی علوم وفنون کی تحصیل وتعلیم کافی نہیں ہے۔ زبان تو علوم کے ابلاغ، اظہار اور تفہیم کا محض ایک ذریعہ [medium] ہے۔ وہ فکری سرمایہ اور خردافروزی امر دیگر ہے جو مادی ترقی کا لازمہ ہے۔

ترقی پذیر اقوام آج وہیں کھڑی ہیں، جہاں مغرب اب سے ۳۰۰ سال پہلے کھڑا تھا۔ ترقی کے حصول کے سفر میں ترقی پذیر اقوام کو بھی عملاً ان تمام راستوں اور مراحل سے گزرنا ہوگا، جن سے غیر ترقی یافتہ مغرب گزر کر ترقی یافتہ ہوا ہے۔

انسان مرکز کائنات: مادی ترقی کے حصول کا پہلا ہدف

اس سفر کا پہلا ہدف انسان اور کائنات کا رُخ ''خدا مرکزی'' سے ''بشر مرکزی'' [Humanism] کی طرف پھیر دینا ہے۔ ترقی کا حصول اور جدیدیت کی تشکیل جن فکری عناصر کی مرہون کرم ہے ان میں کلیدی عنصر ''بشر مرکزی'' [Humanism] ہے۔ چارلس سنگر کے مطابق جدید فکر [modern thought]، جدید سائنس [modern science]، جدید آرٹ [modern art] اور جدید ادب [modern letters] سب ''بشر مرکزی'' کی پیداوار ہیں۔[۲]

مغرب پر نظر رکھنے والا ہر طالب العلم اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ سولہویں صدی سے یورپ میں لادینیت کے نشر وفروغ نے یورپ بلکہ پورے مغربی ذہن میں یہ بات راسخ کردی کہ معاشی عروج

اور تہذیبی برتری کی واحد راہ مذہبی بندشوں اور تحدیدات سے آزادی اختیار کر لینے میں ہی پنہاں ہے۔اس لیے ترقی کا مغربی ماڈل اسلام کے ساتھ غیر مشروط وابستگی اور عملی و محسوس تعلق کے ساتھ ممکن نہیں۔ جہاں توحید ہی مقدمہ ہے اور توحید ہی نتیجہ ہے۔ ماریہ سبرٹ لکھتی ہیں:

> Progress is more than just a journey or an ideal. It is modern destiny. To modern man, and those who want to share his identity, rejecting faith in progress is unbearable. Modern man is defined by progress. His self-esteem is rooted in it and it is his deepest justification for the ruthlessness he displays towards his fellow men and nature.[۳]

آزاد منڈی کی معیشت ترقی کا اصلی میدان

دوسری بات یہ کہ اسلامی مابعد الطبیعیات کے زیر اثر مادی ترقی اس لیے بھی ممکن نہیں کہ حصول ترقی کا سب سے سریع العمل اور زرخیز میدان مارکیٹ [market] ہے۔ مارکیٹ میں صرف ایک ہی اصول کار فرما ہوتا ہے: زر سے زر کا حصول اور سرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری [accumulation of capital for the sake of accumulation]۔ جب بھی ترقی کے مارکیٹ ماڈل پر خارج سے کوئی نظریہ [ideology] مسلّط [impose] کیا جائے گا، شرح ترقی گر جائے گی اور آزاد منڈی کی معیشت [free market economy] کے ذریعے حاصل ہونے والی ترقی کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ بالفاظِ دیگر ترقی کے عمل میں اگر اسلامی احکام اور فرامین کے تحت حدود و قیود عائد کی جائیں گی [جو کہ اسلام کے ماننے والوں کے لیے ناگزیر ہیں] تو ترقی لازماً محدود ہو گی اور لامحدود ترقی کے آگے کھڑی نہیں رہ سکے گی ـــــ اور اگر بالفرض اس عمل پر کوئی قدغن عائد نہ کی جائے تو اس کے نتیجے میں پروان چڑھنے والی اقدار [values] سرمایہ دارانہ ہوں گی، اسلامی نہیں۔

مادّی ترقی مخصوص اقدار اور مستقل تہذیب ہی میں ممکن ہے

تیسرا اہم ترین اور غور طلب پہلو یہ ہے کہ سائنسی ایجادات اور اکتشافات ہرگز غیر اقداری [value neutral] نہیں ہیں۔ جدید اکتشافات کو مغرب کے نظام اقدار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام علوم و فنون اور اس کے مظاہر ایک خاص تہذیب و تمدن، اقدار و روایات اور مابعد الطبیعیات میں پیدا ہوئے اور پھلے پھولے ہیں۔ یہ جہاں بھی جائیں گے اپنی اقدار، روایات، اسلوب حیات اور طرز زندگی ساتھ لے جائیں گے۔ ضیاء الدین سردار لکھتے ہیں:

> ’’جدید سائنس واضح طور پر مغربی ہے۔ پوری دنیا میں جہاں بھی سائنس کو اہمیت حاصل ہے وہ اپنے اسلوب اور طریق کار میں مغربی ہے۔ سائنس داں کا رنگ اور اس کی زبان

خواہ کچھ بھی ہو‘‘۔ [۴]

مغربی سائنس اور نیچرل فلاسفی: بنیادی فرق

ممکن ہے بعض طبائع ’’مغربی سائنس‘‘ کا لفظ سن کر کچھ وحشت محسوس کریں کہ آیا سائنس بھی مشرقی یا مغربی ہوتی ہے؟ یہ امر واقعہ ہے کہ مغرب کی مادی ترقی [material progress]، جدید سائنس [modern science] کی مرہون کرم ہے۔ جدید سائنس قبل از جدید معاشروں میں مروج نیچرل فلاسفی سے اپنی ماہیت اور غایت دونوں میں مختلف بلکہ متضاد ہے۔ قبل از جدید معاشروں کی سائنسی سرگرمی فطرت اور اس کے تقدس کو قائم رکھتے ہوئے اس کے پس پشت کارفرما اسرار کو جاننے سے عبارت تھی۔ اس کا مقصود کائنات اور فطرت کی سچائی، رعنائی، حسن اور شان کو عیاں کرنا تھا۔ جدید سائنس کی ترقی ایک خاص مابعد الطبیعیات کے زیر اثر ممکن ہو سکی ہے۔ اس کا مقصد اور محرک کائنات اور فطرت پر ارادۂ انسانی کا تسلّط ہے اور اس کا استحصال کی حد تک استعمال ہے۔ ہائیڈگر کے افکار اس طرف بڑا واضح اشارہ کرتے ہیں، اس کے مطابق:

> The essence of technology, which he names "the enframing," reduces the being of entities to a calculative order. Hence, the mountain is not a mountain but a standing supply of coal, the Rhine is not the Rhine but an engine for hydro-electric energy, and humans are not humans but reserves of manpower. The experience of the modern world, then, is the experience of being's withdrawal in face of the enframing and its sway over beings.[۵]

قبل از جدید معاشروں میں فطرت اپنے اندر ایک شان تقدیس رکھتی تھی اور جدید معاشروں میں فطرت محض ایک ’’شے‘‘ [commodity] ہے۔ تسخیر کائنات اس کے مقاصد میں شامل نہیں بلکہ کائنات کا استحصال کی حد تک استعمال دنیائے جدید کا عزم ہے۔ مادی ترقی کے حصول کے پس پشت کارفرما دانش بدترین قسم کی سفاکی کی مظہر ہے، مارکوزے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> We submit to the peaceful production of the means of destruction, to the perfection of the waste, to being educated for a defense which deforms the defenders and that which they defend.[۶]

ٹیکنالوجی، جو جدید سائنسی ترقی اور تعیّشات کا سب سے فعال مظہر ہے، کی حقیقت کے متعلق ضیاء الدین سردار لکھتے ہیں:

> Technology is like fire. As long as it is under your control, you can derive benefit from it. Let it get out

of hand, and you will be the first one it will destroy. And then the trees, and then the wood. And finally the earth itself.[۷]

اس لیے جدید سائنس کو غیر اقداری [value neutral] ان معنوں میں سمجھنا کہ اس کے ثمرات کو جس ظرف میں ڈال دیا جائے گا وہ اسی کی شکل اختیار کرلے گا اور ہم ان ثمرات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے اثرات سے متاثر نہیں ہوں گے، نادانی ہے۔ حسین نصر فرماتے ہیں:

’’حقیقت یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اپنے ساتھ ایک خاص تصور کائنات، ایک خاص طرز زیست، ایک خاص طرز عمل اور ایک خاص تصور وقت بھی لاتی ہے...... میں سوچ نہیں سکتا کہ اسلامی تہذیب مغربی ٹیکنالوجی کا ایک اچھا حصّہ اختیار کرے اور کہے کہ یہ اچھا اور کار آمد ہے اور دوسرا حصہ مسترد کردے اور کہے یہ برا اور بے کار ہے۔ آپ جدید ٹیکنالوجی کا جو بھی حصہ اختیار کریں وہ اپنے ساتھ منفی اثرات بھی لائے گا‘‘۔[۸]

مزید کہتے ہیں:

’’مجھے ایسے حضرات سے سخت اختلاف ہے جو کہتے ہیں یورپ جاؤ وہاں بندوقیں بنانا سیکھو، واپس آؤ۔ بندوق بردار فوجیں کھڑی کرو اور باقی ہر چیز بھول جاؤ۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ دراصل تمام چیزیں اکٹھی آتی ہیں۔ بندوق سازی سے لے کر کمپیوٹر اور سیل فون بنانے کی ٹیکنالوجی تک فولاد سازی، جہاز سازی یہ سب صنعتیں آتی ہیں۔ کیوں کہ ان سب کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ ٹیکنالوجی اپنا ایک تصور کائنات رکھتی ہے اور انسان پر عائد کرتی ہے‘‘۔[۹]

ترقی کے فعلی محرکات اور دین کا اقداری نظام

اسلامی مابعد الطبیعیات کے زیر اثر پروان چڑھنے والی مادی ترقی مغرب کے لیے کوئی خطرہ [threat] بن سکے گی یا نہیں۔ یہ سوال تو رہا ایک طرف لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ یہ ترقی مسلمانوں کی اسلام کے ساتھ وابستگی میں ایک بڑا رخنہ ضرور ڈال دے گی۔

مادی ترقی [material progress] کے تمام تر فعلی محرکات ہوس [lust]، لالچ [greed] اور خود غرضی [self-interestedness] سے عبارت ہیں، جو مذاہب خصوصاً اسلام کی بنیادی تعلیمات صبر و شکر، فقر و توکل، غنا و عطا سے بہ راہ راست متصادم ہیں۔ اس لیے ان میں جبر و مقابلہ ناگزیر ہے۔ ماریہ سبرٹ لکھتی ہیں:

Leniency bordering on approval towards such a sin, which is now percived as the vertiable psychological engine of material progress.[۱۰]

مزید لکھتی ہیں:

> Greed and arrogance in individual turn into prosperity and justice for nations and all mankind an invisible hand, a cunning reason that will do him humanity good even its members indulge in evil."ے

ان وجوہات کی بنا پر تیسرے طبقے کے مطابق مغربی ترقی کے حصول کی کوشش اور اسلام کے ساتھ وابستگی بہ یک وقت ممکن نہیں۔ (جاری ہے)

حواشی

1- José Maria Sbert, "Progress" in *The Development Dictionary: A Guide to Knowledge as Power,* [ed., Wolfgang Sachs], London & New Jersey: Zed Book Ltd., 1993, p. 197.

2- Charles Singer, *A Short History of Science: to the Nineteenth Century,* Oxford: Clarendon Press, 1941, p. 167.

3- José Maria Sbert, op.cit., 195.

4- Ziauddin Sardar, *Explorations in Islamic Science,* London: Mansell Pub., 1989, p. 6.

5- *Stanford Encyclopedia of Philosophy Online,* s.v. "Postmodernism", accessed Feb, 4, 2014. http://plato.stanford.edu/entries/postmodernism/

6- Herbert Marcuse, *One-Dimensional Man,* London & New York: Routledge, 1964, p. xxxix.

7- Ziauddin Sardar, *Science, Technology and the*

Development in the Muslim World, London: Croom Helm, 1977, p. 128.

۸- حسین نصر / مظفر اقبال، ’’اسلام، سائنس اور مسلمان‘‘، مشمولہ اقبالیات، جنوری-مارچ، ۲۰۰۷ء، صفحہ ۱۰۔

۹- ایضاً، صفحہ ۱۲۔

10-José Maria Sbert, op.cit., p. 196.
11-Ibid.

تبصرہ کتب مدیر

جماعت اسلامی اور انتخابی سیاست

الیکشن ۲۰۱۳ء میں جماعت کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ

مرتب پروفیسر طارق بٹ

مرتب نے کتاب کے مقدمہ میں کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ

سیاسی جماعتیں انتخابات میں کبھی جیت جاتی ہیں اور کبھی ہار جاتی ہیں اور یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں لیکن پاکستان میں جتنے بھی ایسے انتخابات ہوئے ہیں جن میں جماعت اسلامی نے حصہ لیا ہے وہ ان میں ہمیشہ ہاری ہے لہٰذا انتخابات ۲۰۱۳ء میں جماعت اسلامی کی شکست کوئی معمول کا واقعہ نہیں بلکہ جماعت کے حمایتیوں کو اس کی شکست سے غیر معمولی صدمہ پہنچا ہے۔ جماعت کی قیادت نے خود تو اس شکست کے اسباب کا جائزہ لینے یا مستقبل میں اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنے کا کوئی عندیہ (پبلک میں) نہیں دیا لیکن جماعت کی حمایت کرنے والے اور اس کی فکر سے ہمدردی رکھنے والے کئی دانشوروں نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔

اگرچہ جماعت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ اس کی پالیسیوں پر کھلے عام بحث کی جائے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ جماعت کا فائدہ اس میں ہے کہ اس کی شکست کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے اور مستقبل کے

لیے ایسی تجاویز پیش کی جائیں جن پر عمل کر کے جماعت کی کامیابی کی راہ روشن ہو سکے۔

اس کتاب میں ہم نے اس موضوع پر سوچنے اور خامہ فرسائی کرنے والے دانشوروں کے مصامین جمع کر دیے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ جماعت کے سوچنے سمجھنے والے عناصر اس مجموعے سے استفادہ کریں گے۔ اللہ کرے جماعت کی قیادت بھی اس سے فائدہ اُٹھائے اور اپنے ہمدردوں اور حمایتیوں کی تجاویز پر غور کر کے مستقبل میں ایک ایسا موثر لائحہ عمل تشکیل دے سکے جو اسے کامیابی کی منزل تک پہنچا سکے۔

ان مضامین میں سے اکثر کے لکھنے والے جماعت کے حلقے کے آدمی ہیں اور جماعت سے ان کی خیر خواہی اور محبت معروف ہے۔ سب کا لب ولہجہ شائستہ، مدلل اور متین ہے لہٰذا توقع ہے کہ جماعت کی قیادت ان مضامین میں کہی گئی باتوں پر غور کرے گی اور جن چیزوں کو مناسب سمجھے گی ان پر عمل کرنے سے نہیں ہچکچائے گی۔

مقالہ نگاروں میں سے غالب اکثریت کی رائے یہ ہے کہ جماعت اسلامی کو اپنی فکر اور لائحہ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور اگرچہ بعض دانشوروں نے جماعت کی سیاسی حکمت عملی اور کارکردگی پر بھی بحث کی ہے اور اس کے لیے تجاویز بھی دی ہیں لیکن اکثر اصحاب کی رائے یہ ہے کہ جماعت کو تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جماعت اپنی پالیسیوں کے جمود اور عدمِ احتساب کی وجہ سے زوال پذیر ہے اور اگر اس نے اپنی اصلاح نہ کی اور اپنی پالیسیوں کو تبدیل نہ کیا تو اس کے زوال کو روکنا ممکن نہ ہوگا۔

۲۰۸ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۳۲۵ روپے ہے جو کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کتاب پورب اکیڈیمی اسلام آباد (فون 7092 051-231 ای میل poorab_academy@yahoo.com) نے طبع کی ہے اور مندرجہ ذیل جگہوں سے مل سکتی ہے:
لاہور: کتاب سرائے، بک ہوم؛ **کراچی:** سعید بک بنک؛ **راولپنڈی:** رائل بک ایجنسی؛ **ملتان:** یکن بکس۔

چند تصحیح طلب **مفہومات**

مولف: محمد قطب اردو استفادہ: حامد کمال الدین

مولف کا خیال ہے کہ دین سے دوری ہی مسلمانوں کا اہم مسئلہ نہیں بلکہ دین کے بنیادی تصورات کا سوئے فہم بھی ایک بڑا اور بنیادی مسئلہ ہے۔اس سوءِ فہم کے مختلف اسباب میں سے غیر اسلامی افکار خصوصاً مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور اسے منبع ترقی وخوشحالی سمجھ کر اس کی تقلید اعمی بھی ہے۔مصنف نے پانچ بنیادی اسلامی تصورات یعنی توحید (لا الہ الا اللہ)، عبادت، تقدیر (قضا وقدر) دنیا وآخرت اور تہذیب و تعمیر ارض پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس ضمن میں صحیح عقیدے کو منقح کرتے ہوئے غلطی ہائے مضامین کی نشان دہی کی کوشش کی ہے۔

۴۰۰ صفحات کی اس کتاب پر قیمت درج نہیں اور یہ کتاب سرائے، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور اور مطبوعات ایقاظ، پوسٹ بکس ۱۰۲۶۲ لاہور (فون 1624 403-0323 ای میل matbooateeqaz@gmail.com) سے طلب کی جاسکتی ہے۔

تذکار بگویہ

تالیف: صاحبزادہ انوار احمد بگوی

یہ تذکار بگویہ کی جلد سوم ہے جو ۱۸۸۳ء سے ۲۰۱۰ء تک متحدہ پنجاب کے ایک عظیم علمی اور روحانی خاندان کے علماء کرام اور مشائخ عظام کے خطوط، حالات اور خدمات کے تذکرے و تاریخ پر مشتمل ہے۔ فاضل مولف کے الفاظ میں اس جلد میں شامل ہیں:

☆ خانوادۂ ولی اللّٰہی سے فیض یافتہ علماء اور مشائخ بگویہ کے نام برصغیر کے مشاہیر علماء، مبلغین، اساتذہ اور مشائخ کے خطوط و مراسلات

☆ اسلام کی حفاظت، خدمت وتبلیغ دین اور اشاعتِ علم کے لیے کی گئی محنتوں کا احاطہ

☆ اہم اشخاص کے بارے میں توضیحی نوٹ اور تاریخی واقعات کا پس منظر

☆ مکتوب نگاروں کے مختصر اور مصدقہ سوانحی خاکے اور حزب الانصار کے ساتھ تعلق خاطر

☆ تحریکِ خلافت اور تحریک مولات کے گمشدہ اوراق اور بے نام جانثاروں کا تذکرہ

☆ ضلع سرگودھا میں تحریک خلافت کی سرگرمیاں اور عدم تعاون کے لیے جید علماء کا متفقہ فتویٰ

☆ پنجاب میں محدث بگوی برادران علم الحدیث کے اوّلین استاد اور ناشر حدیث کی حیثیت سے

☆ بعض دلچسپ اور نادر نگارشات کے سکین شدہ عکس اور جہان معنی

☆ ایک منفرد مجموعہ ☆ ایک دلچسپ مطالعہ ☆ ایک تابناک تذکرہ

بلاشبہ یہ تذکار ایک تاریخی دستاویز ہے اور اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اپنے بزرگوں کی خدمات کا تذکرہ جب وہ دینی اور علمی نوعیت کی ہوں بلاشبہ قابل فخر و اعزاز ہے تاہم اگر فاضل مولف اس عظیم الشان ماضی کے ساتھ اگر اپنے ادارے کے حال اور مستقبل کے منصوبوں کا بھی کچھ ذکر کر دیتے تو یہ مزید خرد افروزی کا سبب ہوتا۔

۸۸۰ صفحات کی یہ کتاب مکتبہ مجلس حزب الانصار، جامع مسجد بگویہ بھیرہ (ضلع سرگودھا) سے دستیاب ہے۔ قیمت درج نہیں۔

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو

۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
۲۔ ہمارا دینی نظامِ تعلیم
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال و اخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون

	۱۲۔	مقالاتِ امین (دوجلدیں)
	۱۳۔	مطالعۂ قرآن وحدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)
بروشرز	۱۴۔	پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
	۱۵۔	طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
	۱۶۔	انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
	۱۷۔	دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
	۱۸۔	مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ
	۱۹۔	حقیقتِ تصوف
انگریزی	۲۰۔	Riyadh-us Saliheen (2 Vols)
	۲۱۔	Noble Quran, Part 1
	۲۲۔	Islamization of Laws in Pakistan
عربی	۲۳۔	السلطة التشريعية۔ دراسة مقارنة